نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ ار تاریخ تک شایع ہو جاتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ ر تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (صہ)
بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (صہ) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۳۲	فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء	شمار ۵

ملاحظات ---------- ۲
لفظ "التیتمش (التتمش)" کی لغوی تحقیق ---------- ڈاکٹر عندلیب شادانی ---------- ۹
ہندوؤں کا علم الاصنام ---------- ۲۶
ایک راہبہ کے خطوطِ محبت ---------- طالب صفوی ---------- ۳۱
امیر خسرو ماہر موسیقی کی حیثیت سے ---------- غلام عباس ---------- ۳۵
اسفارِ موسیٰ علومِ جدیدہ کی روشنی میں ---------- ۴۱
مجنوں ---------- جلیل الرحمان اعظمی ---------- ۴۸
نانیجور کے بابو ---------- سید یوسف حسین زیدی ---------- ۵۷
مسلمان کانگریس اور مسلم لیگ ---------- جامعہ ---------- ۶۴
باب الاستفسار ---------- ۷۳
منظومات ---------- محی الدین ایم-اے --- عدم ---------- ۷۷

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

معاون:- جلیل اعظمی

جلد ۳۲	اکتوبر ۳۷ء	شمار ۴

ملاحظات

بُت پرستی و بُت شکنی

دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بُت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بُت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پرواہ کی اور نہ بحرِ ہند کی گہرائیوں کی۔ وہ مورو ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اُٹھے، صرصر و سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لیکر آگے بڑھے اور برق و زلزلہ کے مانند ہر اس بتکدہ کو تباہ و برباد کر گئے جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اٹھتا تھا "جنت عدن" سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بُت پر پڑتی تھی گویا قصرِ فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی وہ مذہب جس کی بنیاد ہی "لات و ہبل" کی مسماری پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہئے تھا اور ہر سومناتھ کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا ــــ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بُت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گرز گراں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف ــــــ جنبد کلید بتکدہ در دستِ برہمن

یونہی دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں "بُت" بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بُت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بت شکن" اسپر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے ـــ کیوں ؟ آیئے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں، شاید تسبیح و زنار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے، ہمیں اس دعوے کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ "محض مادہ" کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اصل چیز جو اسکو باوقعت بناتی ہے وہ انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے، لوہا اپنے معدن کے اندر بیکار ہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے، سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو ایک معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لئے وہ گراں ہے۔ الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص عملی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بیکار شے ہے۔

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ایک "بت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے۔ "بُت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا، جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا، جس وقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا لیکن ایک "بت تراش" کی چھینی اور ایک "برہمن" کے جذبۂ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اسقدر مقدس ہو گیا کہ پیشانیاں اسکے سامنے جھکنے لگیں۔ اس لئے اگر "بت شکنی" کا ہدف صرف وہ "پیکرِ سنگین" قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی، کیونکہ پتھر کو بُت بنا دینے والی، حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہزار بت شکنیوں کے بعد بھی برستور قایم رہ سکتی ہے۔ اگر کسی مخصوص و متعین "بُت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بُت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بیشک "بت شکنی" مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ بُت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس تبکدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے، یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات و ہبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بُت کو توڑا تو اسکا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔ انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہو

لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے، انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصودِ آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسوقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہئے اور ایک کے جذبۂ بُت شکنی کو دوسرے کے جذبۂ بُت پرستی سے متصادم ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا ہے جس پر تمام نوع انسانی متفق ہو سکتی ہے اور یہی وہ دورِ عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرہ کو بے نقاب کر کے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کر دئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہئے، اول اول جب انسان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی تنگ تھا اور ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہو کر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنے میں "خلیفۃ اللہ فی الارض" بنکر سارے کرۂ ارض پر چھا گیا ہے، مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہئے، اس کے مقصود کو بھی بدلنا چاہئے اور اس کے اُصول میں بھی وہ وسعت پیدا ہونا چاہئے تاکہ امتیاز نسل و رنگ اور اختلافِ مسجد و کلیسہ سے بلند ہو کر تمام نوعِ انسانی کو ایک ہی مرکز پر لایا جا سکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے، جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ، یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے۔ مذہب کا دورِ استبداد (Autocracy) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اسوقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے۔ آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے، جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے۔ جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے، اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے، اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اسکی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مسحور کر رکھا ہے، اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت کر رکھا ہے — وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے، وہ کائنات کی نبض میں

گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے۔ وہ گویا ایک "مرکز المراکز" ہے جہاں پہونچکر ماضی، حال و مستقبل سب کی تکمیل ہوتی ہے۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علٰحدہ قرار دے، اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کرلے۔ مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہوگیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے، کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوائے اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہوگی اور نوع انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے۔ اگر معصیت کی بنا پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں۔ اب یا تو یہاں دوزخ ہی رہیگی یا فردوس ہی اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑنا ہے۔

یہ دور ہے اشتراکیت کا، اجتماعیت کا جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی Universality حیات انسانی کے ہر ہر پہلو کو "کائناتی" بنا دینا چاہتی ہے۔ ہمارا خدا، ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو "کائناتی" رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آیا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا، اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے، اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے، وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اُس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے، جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جُھک جاتے ہیں اور وہ معبد، انسان کا "قلب و دماغ" ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا، زنار و تسبیح میں امتیاز کا زمانہ ختم ہوگیا، جن کو ہم بُت سمجھ کر پوجتے تھے وہ از خود سرنگوں ہوتے جا رہے ہیں، جس کی پرستش ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہے، اس لئے ہکو بت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور پرستاران خدا کی تلاش حطیم کعبہ سے باہر کہیں اور۔

دنیا میں بت پرستی اب بھی قایم ہے لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں، بُت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشہ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بُت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بُت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ بُت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے، سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی، لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا رسول کا نام ہوگا لیکن صرف نمود و نمایش کیلئے ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہوگی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہوگی — ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان، ان کی دامنِ دار طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی خاک شفا کی سُمرنیں۔ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے، کوئی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے، جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کی ذریات کا ایک ہجوم ان کے ساتھ ہوگا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہوگا کہ "خداوند لقا" اپنے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جب یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوائے نحوی و صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہوگا، جب یہ حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہوگا، جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوائے خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے۔ سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے تو سوائے ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منھ سے نہ نکلے گا۔ فرشتوں کی باتیں، جنات کے افسانے، معجزہ و کرامات کے واقعات، اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں، اخلاق کا درس بھولے سے اگر کبھی دیں گے بھی تو وہ بہشت کی طمع، جہنم کے خوف سے خالی نہ ہوگا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مُزد و تعزیر سے بہت بلند ہونا چاہئے۔

یہ اگر رواداری و ہمدردی کا درس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غصب کر کے آئے ہیں، یہ اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت و رافت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکروں سے مار کر باہر نکلے ہیں۔ یہ لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جھوٹ بولنے کا حق سوائے ان کے کسی اور کو حاصل نہ ہو، عجز و انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ آ آ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بُت جن کو اسوقت توڑنے کی ضرورت ہے، اور یہ ہیں آجکل کے وہ "لات و ہبل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

کانگریسی حکومت کے برکات

ملک میں کانگرس وزارتیں مرتب ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا، صرف چند مہینے ہوئے ہیں، لیکن اسی مختصر مدت میں جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان لوگوں کا منھ بند کرنے کے لئے کافی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں انتظامی قابلیت مفقود ہے اور اگر انگریزی حکومت

ہندوستان سے اُٹھ جائے تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

آئین جدید کے نفاذ سے قبل جب صوبوں کی حکومت بالکل گورنروں کے ہاتھ میں تھی اور وزرا ان کے آلۂ کار کی حیثیت رکھتے تھے، اس وقت کا حال بھی لوگوں کو معلوم ہے، اس کے بعد جب آئین جدید کا نفاذ ہوا اور کانگرس کے ترتیبِ وزارت سے انکار کرنے کے بعد اقلیت نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اسوقت کی "صلاحِ کار" بھی عرصہ کی بات نہیں اور اب کہ کانگرس کے چند آشفتہ سر برسرِ اقتدار آ گئے ہیں اس کا حال بھی ہمارے سامنے ہے ——— پھر اگر عقل و فہم سے کام لینا کوئی گناہ نہیں ہے تو ان تینوں زمانوں پر غور کرو اور خود ہی فیصلہ کرو کہ ان میں کوئی فرق پایا جاتا ہے یا نہیں اور وہ فرق ملک و قوم کے لئے مفید ہے یا مضرت رساں۔ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے لیکن عقل سے پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہو۔ یہ سب کچھ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے اور پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے!

ایک حکومت پر تنقید کرنے کے لئے بہترین معیار ملک و قوم کی اقتصادی و ذہنی حالت کا مطالعہ ہے۔ اگر تم یہ دیکھو کہ کسی حکومت کے زیرِ اثر قوم کی یہ دونوں حالتیں پستی میں ہیں تو تم کو سمجھ لینا چاہئے کہ حکومت ناکام ہے اور اگر ان میں بلندی کے آثار نظر آئیں تو یقین کرنا چاہئے کہ حکومت کامیاب ہے۔

اب سے قبل جب کانگرس نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لی تھی اقتصادی تباہیاں انتہائی حد کو پہونچ چکی تھیں اور حکومت کو مطلقاً اس کی پرواہ نہ تھی، اب ہر چند حالت وہی ہے لیکن حکومت کے مقاصد میں سب سے پہلا مقصد یہی ہے کہ ملک سے فقر و افلاس کی لعنت کو دور کیا جائے، چنانچہ بجٹ اُٹھا کر دیکھئے کہ جو رقم اس مقصد کی تکمیل کے لئے متعین ہے کیا اس سے پہلے بھی کبھی صرف کی گئی ہے۔

ذہنی انقلاب کا جو عالم ہے وہ اس سے بھی زیادہ روشن و نمایاں ہے۔ پہلے ہر ہر شخص اپنے آپ کو ایسا ذلیل محکوم سمجھتا تھا کہ وزراء و حکام کے آرائش کدوں تک پہونچنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتا تھا۔ لیکن اب ایک برہنہ پا برہنہ سر آشفتہ حال کسان جو اپنے جھونپڑے سے باہر قدم نکالتے ہوئے کانپتا تھا، نہایت آزادی سے کونسل ہال میں جا سکتا ہے، رات دن کے ۲۴ گھنٹوں میں ہر وقت وزراء کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور فرش پر ان کے برابر بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر سکتا ہے۔ اصل چیز جس سے حقیقی آزادی کی روح پیدا ہوتی ہے، احساسِ مساوات ہے اور یہ اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک دولت و سرمایہ داری کے پیدا کئے ہوئے مراتب و مدارج کو نہ مٹایا جائے۔ کانگرس نے برسرِ حکومت ہو کر سب سے پہلی ضرب اسی بت پر لگائی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ جس قریہ میں چلے جائیے ادنیٰ طبقہ کا ہر ہر فرد اس جذبہ سے معمور نظر آتا ہے کہ اب حکومت اسی کی ہے اور دولت و استبداد کے مقابلہ کے لئے طیار نظر آتا ہے۔

جسوقت جسم میں کوئی فاسد مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور نشتر چبھو کر اس مادہ کو دور کیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ

تکلیف ماؤف مقام ہی میں ہوتی ہے۔ پھر دیکھو کہ اسوقت سب سے زیادہ اضطراب کس جماعت کو ہے، کس طبقہ کو کانگرس کی وزارت سے زیادہ تکلیف پہونچ رہی ہے ـــــ وہ طبقہ زمینداروں کا ہے، تعلقہ داروں کا ہے یعنی ان سرمایہ داروں کا جنھوں نے ملک کو نکبت و افلاس کی انتہائی حد تک پہونچا دیا ہے، جو اپنی لذت کام و دہن کیلئے ملک کی بڑی آبادی کو بھوک اور فاقہ کے عذاب میں مبتلا کرنے سے کبھی احتراز نہیں کرتے، جو اپنی نفسانی ہوسرانیوں کے پورا کرنے کے لئے غریبوں کے اخلاق کا احترام کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتے، جو اپنے لئے جامۂ حریر فراہم کرنے کے لئے اپنی رعایا کو ننگا کر دینے سے بھی باز نہیں آتے، اور جو اپنے موٹروں کے پٹرول کے لئے کاشتکاروں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑنے کے لئے طیار ہیں۔

پھر کیا کانگرسی حکومت کے برکات ثابت کرنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے، کیا نوع انسانی کی خدمت کی اس سے بہتر صورت کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے، کیا شرافت و ہمدردی، اخلاق و انسانیت پرستی کا معیار علم و تہذیب کی دنیا میں کبھی یہ قرار نہیں دیا گیا کہ مظلوم کی حمایت کی جائے اور ظالم کی مخالفت، اور کیا رئیسوں زمینداروں اور تعلقہ داروں سے زیادہ ظلم نوع انسانی پر کسی اور نے کیا ہے۔

چنگیز و ہلاکو کے مظالم تو بالکل عارضی حیثیت رکھتے تھے، ایک وقتی طوفان تھے کہ آئے اور گزر گئے، لیکن ان "دولت زادگانِ کبار" کی ذات تو جسم ملی کے لئے ناسور بنی ہوئی ہے۔ حیات قومی کے لئے تپِ دق کا حکم رکھتی ہے بدترین قسم کی جونک ہے جو آہستہ آہستہ خون چوس رہی ہے اور خدا کی خدائی میں ایسی زبردست لعنت ہے جس سے انسانیت لرزہ براندام ہے۔

کیا آپ نے کبھی افعی کو ضرب لگا کر دیکھا ہے کہ وہ کس قدر پیچ و تاب کھاتا ہے ـــ اگر نہیں دیکھا تو اسوقت زمینداروں اور تعلقہ داروں کی حالت دیکھئے، اُن کے اضطراب و پریشانی کا مطالعہ کیجئے اور اس سے اندازہ کیجئے اُس ضرب کا جو کانگرس کے ہاتھ سے ان کو پہونچی ہے۔

پھر اگر یہ صحیح ہے کہ ہندوستان اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک یہاں کے زراعت پیشہ طبقہ کی اصلاح عمل میں نہ آئے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس مقصود کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زمینداروں کو فنا نہ کر دیا جائے اور اس لئے اگر کانگرس برسرِ حکومت ہونے کے بعد سوائے ان بتوں کے توڑنے کے اور کچھ نہ کرتی تو بھی ملک و قوم کو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ تمام نظم و نسق کو پلٹ کر رکھ دینا اور نظام حکومت کے عروق میں نیا خون دوڑا دینا کہ احساس انقلاب کے معجزہ کے سوا کسی اور چیز سے اسے تعبیر ہی نہیں کر سکتے۔

لفظِ "التمش" کی لغوی تحقیق

دہلی کے والا مرتبت سلطان شمس الدین التمش کے نام سے (جس نے ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء سے ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء تک فرمانروائی کی) ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے مگر اس کے نام کے آخری جزو "التمش" کی صحیح قرأت اور املا بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ مورخین میں خصوصاً اور دیگر مصنفین میں عموماً اس لفظ کے متعلق ایک زمانۂ دراز سے اس قدر اختلاف چلا آرہا ہے کہ اگر آج اُس کی اُن تمام شکلوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے جو مختلف کتابوں میں ملتی ہیں تو ایک نہایت طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جن لوگوں نے اس لفظ کو اپنی تصانیف میں درج کیا ہے اُنھیں پانچ گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

اول ۔ وہ یورپین اور ہندوستانی مورخین جنھوں نے ہندوستان کی تاریخیں انگریزی زبان میں لکھی ہیں۔

دوم ۔ وہ ہندوستانی علماء اور اہلِ قلم جنھوں نے ہندوستان کی تاریخیں یا ہندوستان کے متعلق دوسری تصانیف اُردو میں لکھی ہیں۔

سوم ۔ وہ یورپین اور ہندوستانی جنھوں نے فارسی تاریخوں کے ترجمے انگریزی زبان میں کئے ہیں

چہارم ۔ وہ مستشرقین (خصوصاً جرمن) جنھوں نے یورپ کے مختلف کتب خانوں کے فارسی مخطوطات کی فہرستیں مرتب کی ہیں۔

پنجم ۔ وہ ہندوستانی، ایرانی اور یورپین فضلا جنھوں نے کسی کتاب کے مقدمہ، حاشیہ، یا خلاصہ میں اس لفظ "التمش" کو کسی نہ کسی شکل میں لکھا ہے۔ یا تاریخ کے علاوہ کسی دوسری قسم کی کتاب میں یا اس کے ترجمہ میں درج کیا ہے یا ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک کی تاریخ کے ضمن میں سلطان شمس الدین کا ذکر کیا ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کی تصانیف سے "التمش" کی مختلف شکلیں پیش کرتے ہیں۔

گروہ اول:۔

(۱) مارش مین ——— تاریخ ہند ——— اَلتَمَش ——— Altumsh

(۲) میڈوز ٹیلر ——— تاریخ ہند ——— اَلتَمِش ——— Altmish

(۳) کین ——— تاریخ ہند ——— اِلتِمش ——— Iltimsh

(۴) الفنسٹن ——— تاریخ ہند ——— اَلتَمش ——— Altamish

(۵) ٹامس ——— دہلی کے پٹھان بادشاہوں کی تاریخ ——— اَلتَمش ——— Altamsh

(۶) ڈوئی ——— دی پنجاب ——— اَلتَمش ——— Altamsh

(۷) اسمتھ ——— آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا ——— اِلتُتمش ——— Iltutmish

(۸) وولزلے ہیگ ——— کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ——— اَلتُمش ——— Iltutmish

(۹) ایشوری پرشاد ——— تاریخ ہند ——— اِلتُتمش ——— Iltutmish

(۱۰) بھال ——— تاریخ ہند ——— اَلتَمش ——— Altamsh

(۱۱) نیٹسن ——— آل اباؤٹ دہلی ——— اَلتَمش ——— Altamsh

گروہِ دوم :-

(۱۲) مولوی ذکاء اللہ ——— تاریخ ہند ——— التمش

(۱۳) سرسید احمد خاں ——— آثار الصنادید ——— التمش

(۱۴) سید علی بلگرامی ——— تمدنِ ہند ——— التمش

(۱۵) بشیر الدین احمد ——— واقعات دار الحکومت دہلی ——— التمش

(۱۶) سید ہاشمی فرید آبادی ——— تاریخ ہند ——— اِیل تِمش یا اِلتمش

گروہِ سوم :-

(۱۷) ایلیٹ، ڈاسن ——— تاریخ ہند ——— اَلتَمش ——— Altamsh

ایلیٹ ڈاسن کی تاریخ ہند میں ہندوستان کی تمام فارسی تاریخوں کے خلاصے اور ضروری حصے انگریزی میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۸) بِرگس ——— ترجمۂ تاریخ فرشتہ[1] بزبانِ انگریزی ——— اَلتَمش ——— Altmish

(۱۹) بلاخمن ——— ترجمۂ آئین اکبری[2] ——— " ——— "

(۲۰) گلیڈون ——— " ——— " ——— التمش ——— Altumsh

(۲۱) ریورٹی ——— ترجمۂ طبقاتِ ناصری[3] " ——— اِیلتِمش ——— Eyal-timish

---

[1] تاریخ فرشتہ، مطبوعہ لکھنؤ (نولکشور پریس) میں التمش تحریر ہے۔

[2] آئین اکبری، مطبوعہ لکھنؤ، نولکشور پریس میں ایلتمش تحریر ہے۔

[3] طبقات ناصری، مطبوعہ کلکتہ میں التمش تحریر ہے۔

(۲۲) رینکنگ ـــــ ترجمۂ منتخب التواریخ بدایونی[1] ـــــ " ـــــ " ـــــ " ـــــ

(۲۳) دے ـــــ ترجمۂ طبقات اکبری[2] ـــــ " ـــــ التمش ـــــ Altamsh

(۲۴) باسو ـــــ ترجمۂ تاریخ مبارکشاہی[3] ـــــ " ـــــ ایلتمش ـــــ Eyal-timish

(۲۵) بیوریج ـــــ ترجمۂ تزک بابری[4] ـــــ " ایلتمش (التمش) Altmish (Altamsh)

گروہ چہارم :-

(۲۶) ریو - فہرستِ مخطوطاتِ فارسی، برٹش میوزیم، لندن - طبقاتِ ناصری اور جوامع الحکایاتِ عوفی، دونوں کے ذکر میں (ایلتمش) Eltutmish لکھا ہے۔

(۲۷) ایتھے - فہرست مخطوطات فارسی - انڈیا آفس، لندن - تاج المآثر کے ذکر میں التمش Altatmesh اور بوڈلین، آکسفورڈ، کی فہرستِ مخطوطات میں طبقاتِ ناصری کے ذکر میں التمش Altamish تحریر کیا ہے۔

(۲۸) اوٹر (Ather) - فہرستِ مخطوطات München - طبقات ناصری - ذکر میں التمش (Altamsch) تحریر کیا ہے۔

(۲۹) فلیوگل - فہرست مخطوطات - Weim - تاج المآثر کے ذکر میں التمش Alatmish تحریر کیا ہے

(۳۰) ہرودکلمن - فہرست مخطوطات، ہیمبرگ - جامع الحکایات (جوامع الحکایات) کے ذکر میں ایلتمش Altutmish تحریر ہے

(۳۱) پرڈش نے فہرست مخطوطات - برلن - تاج المآثر اور طبقاتِ ناصری[5] کے ذکر میں التمش Altamsh تحریر کیا ہے۔

گروہ پنجم :-

(۳۲) محمد بن عبدالوہاب قزوینی - علامہ موصوف جو علومِ مشرقیہ کے زبردست فاضل اور چہار مقالہ، اور دوسری ایسی ہی اہم کتابوں کے نامور اڈیٹر ہیں، لباب الالباب عوفی کے تعلیقات میں تین مختلف مقامات پر (صفحہ ۲۸۹-۳۲۲-۳۳۰) اس لفظ کو استعمال کیا ہے اور تینوں جگہ التمش لکھا ہے - تلفظ کی تعیین کے لئے اعراب بھی لگا دئے ہیں۔

(۳۳) نیرِ رخشان - الیلیٹ ڈاسن کی تاریخ ہند کے لئے بیشتر مواد انھیں نے بہم پہونچایا تھا۔ خصوصاً خسرو کی مثنویوں

---

[1] منتخب التواریخ، مطبوعۂ کلکتہ میں التمش تحریر ہے۔

[2] طبقات اکبری مطبوعۂ لکھنؤ - نولکشور پریس - میں التمش تحریر ہے۔

[3] تاریخ مبارکشاہی مطبوعہ کلکتہ میں ایلتمش اور التمش تحریر ہے۔ کتاب کی تصحیح شمس العلماء ہدایت حسین صاحب نے کی ہے۔

[4] تزک بابر کا اردو ترجمہ نصیر الدین حیدر صاحب نے کیا ہے جو محمڈن پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا ہے۔ اس میں بھی التمش تحریر ہے۔

[5] عبدالمقتدر صاحب نے فہرست مخطوطاتِ فارسی، بانکی پور، میں طبقاتِ ناصری کے ذکر میں ایلتمش Altamish تحریر کیا ہے۔

اور دوسرے مصنفین کی مشکل فارسی کتابوں کے خلاصے فارسی نثر میں تیار کئے تھے۔ یہ سب چیزیں ایلیٹ صاحب کے مسودات اور دوسرے کاغذات کے ساتھ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔ خسرو کی مثنوی دول رانی خضر خاں کے خلاصہ میں انھوں نے سلطان کا پورا نام شمس الدین التمش لکھا ہے۔ لیکن لفظ التمش پر اعراب نہیں لگائے ہیں۔

(۳۴) ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب نے جوامع الحکایات عوفی کے دیباچہ کے طور پر ایک کتاب بزبانِ انگریزی لکھی ہے۔ اس میں سلطان شمس الدین کا نام اِلتُتمش Iltutmish لکھا ہے۔

(۳۵) بارتولڈ (بارٹ ہولڈ)۔ نے اپنی کتاب Turkistan down to the mongol Invasion میں سلطان کا نام ایلتمش Iltutmish لکھا ہے۔

(۳۶) براؤن صاحب نے تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم میں سلطان کا نام ایلتتمش Iltatmish تحریر کیا ہے

(۳۷) گب صاحب نے سفرنامہ ابن بطوطہ کے ملخص انگریزی ترجمہ میں ایلتتمش یا التمش Iltutmish یا Altamsh تحریر کیا ہے۔

(۳۸) فلیوگل صاحب نے جن کا ذکر نمبر ۲۹ کے ماتحت ہو چکا ہے۔ کشف الظنون حاجی خلیفہ کے جرمن ترجمہ میں اِلتمش Iletmsch لکھا ہے حالانکہ فہرست مخطوطات میں Altmisch تحریر کیا ہے۔

کشف الظنون کے عربی متن میں جو فلیوگل صاحب کا مرتبہ ہے طبقاتِ ناصری کے ذکر میں التمش تحریر ہے۔

(۳۹) سفرنامہ ابن بطوطہ کے فرنچ مترجم نے اُلتمش (Altmish) تحریر کیا ہے اور خود ابن بطوطہ نے ساری دنیا سے الگ لُلتمش لکھا ہے اور اعراب بھی بیان کر دئے ہیں۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے:۔

ذکر السلطان شمس الدین لُلتمش۔ وضبط اسمہ بفتح اللام الاولی وسکون الثانیہ وکسر المیم وشین معجم۔

(۴۰) کالن ڈیوس۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام۔ اِلتُتمش Iltutmish)

(۴۱) ہیمر پورگشٹال۔ سوانح سلطان قطب الدین ایبک بزبانِ جرمن اُلتمش Altmisch

اہلِ علم کی اس کثیر جماعت میں صرف چند اشخاص ایسے ہیں جنھوں نے لفظ "ایلتمش" کی قرأت کے متعلق کچھ لکھا ہے یا اس کی تعیین کی کوشش کی ہے۔ باقی تمام حضرات نے یا تو ایک دوسرے کی نقل و تقلید پر اکتفا کی ہے یا بغیر کسی معقول وجہ کے اس لفظ کی کوئی ایک شکل اختیار کر لی ہے آج تک اس لفظ کے متعلق جتنی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ جسقدر تحقیقات ہوئی ہے اور محققین جس نتیجہ پر پہونچے ہیں پہلے اس کا بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ میرے دلائل و نتائج کا اس سے مقابلہ کرنے کے بعد قارئین ایک صحیح رائے قایم کر سکیں۔

کین صاحب (نمبر ۳) اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ "کتبوں میں یہ لفظ بشکل التمش Altimsh پایا جاتا ہے" مگر یہ بیان دو حیثیتوں سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ اسوقت تک عہد شمسی کے جو ایک درجن سے زیادہ کتبے موجود ہیں ان میں سے ایک

دو کو چھوڑ کر جن میں بعض لوگوں نے اس لفظ کو "التمش" پڑھا ہے باقی سب میں ایلتمش یا التمش تحریر ہے۔

دوسرے یہ کہ ان کتبوں میں لفظ "ایلتمش" پر اعراب لگے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کین صاحب نے حروف کے اعراب اور حرکت و سکون کی تعیین کس طرح کی۔ اعراب کی غیر موجودگی میں اس لفظ کی کئی درجن مختلف قرأتیں ہو سکتی ہیں اور جب تک کسی ایک قرأت کی ترجیح کی وجہ بیان نہ کی جائے وہ قابل تسلیم نہیں۔

مسٹر دے (نمبر ۲۳) مترجم طبقاتِ اکبری نے اس لفظ کو التمش (Altamsh) پڑھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے (ریورٹی صاحب، مترجم طبقات ناصری کی قرأت) ایلتمش (Iyal-timish) کے مقابلہ میں التمش (Altamsh) کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس لفظ کا املا اور تلفظ ترکی زبان میں چاہے جو کچھ بھی رہا ہو فارسی تاریخوں میں اسکا املا "التمش" ہی ہے۔ دے صاحب کے اس بیان پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اعراب کی تعیین کس طرح کیگئی اور حرکت و سکون کا حال کیونکر معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ فارسی تاریخوں میں اس لفظ کی صرف یہی شکل پائی جاتی ہے کیونکہ فارسی کی اکثر تاریخوں میں یہ لفظ اور بہت سی شکلوں میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ ضمناً یہاں صرف اسقدر بیان کر دینا کافی ہے کہ منتخب التواریخ بدایونی کے دو قلمی نسخے جو رنیلنگ صاحب (نمبر ۲۲) کے پیشِ نظر تھے ان میں یہ لفظ صاف "ایلتمش" لکھا ہوا تھا۔ ایضاً

ریورٹی صاحب (نمبر ۲۱) جنھوں نے طبقاتِ ناصری کا ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا ہے اور بہت کچھ داد تحقیق دی ہے اس لفظ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "طبقاتِ ناصری کے جو قلمی نسخے میرے پیشِ نظر تھے ان میں سے بعض میں، نیز بعض دوسری تاریخوں میں "ایلتمش" لکھا ہوا تھا۔ اور بعض دوسری کتابوں میں "ایلتمش" درج تھا لیکن اس کا صحیح املا ایلتمش (Iyal-timish) ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر نسخوں میں طبقاتِ ناصری کا جو سب سے قدیم نسخہ ہے اُس میں (اس لفظ پر) اعراب لگے ہوئے ہیں۔ ایلتمش بظاہر ایک مرکب لفظ معلوم ہوتا ہے جس کا پہلا جزو (یعنی ایل) ویسا ہی ہے جیسا ایل ارسلان اور ایلدز وغیرہ کا ہے اور دوسرے جزو کو قلتمش اور اسی جیسے دوسرے الفاظ کے جزو ثانی (تمش) پر قیاس کرنا چاہیئے"

ایلتمش (ایلتمش) میں حرف "ی" کو متحرک سمجھنا سخت غلطی ہے یا تو طبقاتِ ناصری کے اس نسخہ میں جسکا ذکر ریورٹی صاحب نے کیا ہے اعراب غلط لگے ہوئے تھے یا پھر خود ریورٹی صاحب نے غلط پڑھا۔ اسکے علاوہ ایل ارسلان اور ایلدز میں بھی حرف "ی" متحرک نہیں ہے نہ ان دونوں لفظوں کے جزو اول

لہ دیکھو کرانیکلس آف دہلی پٹھان کنگس آف دہلی۔ صفحہ ۴۴

(ایل) کا تلفظ یکساں ہے۔ ایل ارسلان کا "ایل" بروزنِ "فیل" ہے اور ایلدز کا بروزنِ دِل۔ اس کی تفصیل بھی آگے چل کر اس کے محل پر بیان کی جائے گی۔

برگس صاحب (نمبر ۱) کا خیال ہے کہ یہ نام لفظِ "التمش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ترکی زبان میں "ساٹھ کے ہیں چونکہ شمس الدین ایلمر تبہ غلام کی حیثیت سے ساٹھ تومان میں فروخت ہوا تھا اس لئے یہ نام ہوگیا۔" لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ساٹھ تومان میں فروخت ہونے کی وجہ سے شمس الدین کو التمش کہنے لگے۔

ٹامس صاحب (نمبر ۵) "دہلی کے پٹھان بادشاہوں کی تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ "اس بادشاہ کے نام (یعنی التمش) کے صحیح ہجا کے متعلق مشرقی مصنفین اور ہندوستان کے سکہ ساز کوئی قطعی رائے نہیں رکھتے تھے۔ تاریخ وصاف میں اَلتِمِش Altimish لکھا ہے۔ رشید الدین، میر خواند اور صاحبِ خلاصۃ الاخبار کے درمیان اس لفظ کے املا کے متعلق کچھ نہ کچھ اختلاف پایا جاتا ہے"

ٹامس صاحب کا یہ کہنا کہ مشرقی مصنفین اور ہندوستان کے سکہ ساز لفظِ ایلتمش کے صحیح ہجا کے متعلق کوئی یقینی اور قطعی رائے نہیں رکھتے تھے کسی طرح درست نہیں۔ فارسی کتابوں میں اعراب لگانے کا دستور نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹامس صاحب نے تاریخ وصاف میں لفظ "التمش" لکھا دیکھ کر یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ اس کا تلفظ "اَلتِمِش" (Altimish) ہے۔ تاریخ وصاف کا ایک قلمی نسخہ جو برٹش میوزیم لندن میں راقم کی نظر سے گزرا ہے اس میں "ایلتمش" تحریر ہے رشید الدین کی جامع التواریخ کا قلمی نسخہ بھی برٹش میوزم میں میں نے دیکھا ہے۔ اس میں صاف "ایلتمش" لکھا ہے اور میر خواند نے بھی روضۃ الصفا میں اس لفظ کی یہی شکل اختیار کی ہے[1]۔ رہی خلاصۃ الاخبار تو وہ روضۃ الصفا کا خلاصہ ہے جو صاحبِ روضۃ الصفا کے پوتے خواند میر کی تالیف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ روضۃ الصفا اور خلاصۃ الاخبار میں اس لفظ کی دو مختلف شکلیں نہیں ہو سکتیں۔ ان دونوں کتابوں کے بعض قلمی یا مطبوعہ نسخوں میں اگر اختلاف پایا جائے تو اُسے لازمی طور پر کتابت کی غلطی سمجھنا چاہئے چنانچہ خلاصۃ الاخبار کا جو قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا ہے اس میں "ایلتمش" ہی تحریر ہے۔

غالباً یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ بیان کی گئی ہے خود وصاف ہی کا لکھا ہوا ہے اور جس کے متعلق ہم ایک علیحدہ مقالہ میں بحث کریں گے ایسی صورت میں تاریخ وصاف اور جامع التواریخ میں لفظ "ایلتمش" کی دو مختلف شکلیں کوئی معنی نہیں رکھتیں اور یہ کھلا ہوا ثبوت ہے اس بات کا کہ کاتبوں نے کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ الغرض رشید الدین، میر خواند اور صاحبِ خلاصۃ الاخبار کے درمیان اس لفظ کے ہجا کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ ٹامس صاحب کو جو اختلاف نظر آیا وہ صرف کاتبوں کی ناواقفیت اور بے پروائی کا

---

[1] دیکھو روضۃ الصفا مطبوعہ بمبئی جلد ۴۔ صفحہ ۱۸۵۔

نتیجہ ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ مختلف کتابوں کے قلمی نسخوں میں جو اس لفظ کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں وہ مصنفین کے اختلافِ رائے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار کاتب ہیں۔ کسی کتاب کا کوئی قلمی نسخہ جب تک خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ ہو اس قسم کی تحقیقات میں کوئی حجت قطعی نہیں ہو سکتا۔

اب رہا ٹامس صاحب کے بیان کا دوسرا جزو، یعنی ہندوستان کے سکہ ساز اس لفظ کے املا کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس کا جواب ہم آگے چل کر دیں گے جہاں سکوں سے بحث کی جائے گی۔

ریڈ ہاؤس صاحب نے (جو ترکی زبان کے بہت بڑے "علامہ" سمجھے جاتے ہیں اور جو ایک ضخیم "ترکی انگریزی" لغت کے مولف بھی ہیں) لفظِ التمش کے متعلق جو اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ ان تمام آراء سے زیادہ مضحکہ خیز ہے جنکی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ ان کا قیاسی گورکھ دھندا پیش کرنے سے قبل مُلّا عبد القادر بدایونی، صاحبِ منتخب التواریخ کا قول نقل کر دینا ضروری ہے کیونکہ ریڈ ہاؤس صاحب نے جو بلند عمارت تعمیر کی ہے اس کی بنیاد بدایونی ہی کے قول پر رکھی ہے۔

ملا صاحب فرماتے ہیں:-

"وجہ تسمیہ بایلتمش آنست کہ تولدِ وے در شبِ گرفتِ ماہ واقع شدہ بود و ترکان انچنیں مولود را ایلتمش میخوانند"

(ایلتمش نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چاند گہن کی رات میں پیدا ہوا تھا اور ترک ایسے بچہ کو ایلتمش کہتے ہیں)

جس طرح برگسن صاحب کا "ساٹھ تومان" والا قول بے بنیاد ہے اسی طرح ملا صاحب کے اس قول کی بھی کوئی اصل معلوم نہیں ہوتی اور فرشتہ کے بیان سے تو اس کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں مذکور ہے کہ "سلطان قطب الدین نے ایلتمش اور ایبک دو ترک غلام ایک لاکھ جیتل میں خرید ے تھے۔ ایبک کا نام طمغاج رکھا اور التمش کو جس کا پہلے کچھ اور نام تھا التمش کے نام سے موسوم کیا۔

ظاہر ہے کہ اگر التمش کا نام سلطان قطب الدین نے التمش رکھا اور پہلے اس کا کچھ اور نام تھا تو چاند گرہن کی رات میں پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن میرے نزدیک فرشتہ کا یہ بیان خود ناقابلِ اعتبار ہے کیونکہ کسی دوسرے مستند ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور کسی واقعہ کے چار سو برس بعد اس کے متعلق کسی شخص کا مجرد قول کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔

اب ریڈ ہاؤس صاحب کی بلند پروازی ملاحظہ فرمایئے۔ ٹامس صاحب نے لفظِ ایلتمش کی وہ سب مختلف شکلیں جو انھیں فارسی کی بعض تاریخوں میں ملی تھیں اور بدایونی کا مندرجِ بالا قول ریڈ ہاؤس صاحب کے سامنے پیش کر کے انکی رائے طلب کی تھی۔ ریڈ ہاؤس صاحب نے جواب میں فرمایا کہ:-

"بدایونی کے قول کو متن قرار دیکر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "آی" ترکی میں چاند کو کہتے ہیں اور شاید تُتمش دراصل تُوتمش تھا جس کے معنی ہیں "اُس نے گہن لگایا"۔ لیکن چاند گہن کا بیان کرنے کے لئے ہمیشہ فعلِ مجہول "تُوتمش" استعمال کیا جاتا ہے جیسے "آی تُوتمش" کے معنی ہوئے "چاند کو گہن لگا"۔ "آی تُوتمسی" چاند گرہن کو کہتے ہیں۔

اس صورت میں ہمارے لفظ (التتمش) کا حرف "ل" اپنی اصلی جگہ سے ہٹا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ بدایونی کا یہ بیان اُس قسم کے مشرقی قیاسات میں سے ہو جن سے ہم اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ بہرحال اسے تسلیم کرتے ہوئے اور سنسکرت میں یہ لفظ جس طرح لکھا ہوا ملتا ہے (یعنی तितितिमिषि) اسے بھی ملحوظ رکھتے ہوئے میری رائے یہ ہے کہ کاتبوں نے حرف "ل" کو اُس کی اصلی جگہ سے ہٹا دیا ہے۔ اور حرف "و" حذف ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے ترکی لغات میں اکثر (الفاظ میں) "و" کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارا لفظ آیتتلمش یا آیتتمش بنتا ہے اور یہ آخری شکل سنسکرت کی مندرجِ بالا شکل سے مشابہ ہے اور "گرفتِ ماہ" کے معنی بھی اس سے ادا ہو گئے اس لفظ کا صحیح املا آی تُتلمسی اور اصح آی تُتلمسی مع الواو ہونا چاہئے۔"

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں سید ہاشمی فرید آبادی صاحب (نمبر ۱۶) کی تاریخ ہند میں یہ لفظ "ایل تتمش یا التمش" تحریر ہے اور اس شکل کے اختیار کرنے کی وجہ سید صاحب نے یہ بیان فرمائی ہے کہ "جرمن مستشرقوں کی تازہ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحیح لفظ "ایل تتمش" ہے اور غلط العام کی پیروی کی جائے تو "التمش" پڑھنا چاہئے۔"

فی زمانہ اردو مستشرق، مسٹر بارتولڈ (نمبر ۳۵) کے معین کئے ہوئے تلفظ کو سب سے زیادہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے ان کے نزدیک یہ لفظ "اِلْتُتْمُش" (ایل۔ تُت۔ مِش) ہے چنانچہ ڈاکٹر ہارووڈز نے "ایجی گریفیا انڈو مسلیمیکا" میں شمس الدین کے کتبوں کا ذکر کرتے ہوئے اسی تلفظ کو صحیح مانا ہے اور مسٹر بروکلمن (نمبر ۳۰) نے بھی کتبخانہ ہامبرگ کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں، جوامع الحکایات عوفی کے ضمن میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر بارتولڈ نے جس مقالہ میں اس لفظ سے بحث کی ہے وہ اس وقت میرے پیشِ نظر نہیں جو اُن کے دلایل پر جرح و تنقید کی جا سکے لیکن ان کی تحقیقات کا نتیجہ اوروں نے بھی نقل کیا ہے اور خود اُن کی اپنی تالیف Turkestan. down to the Mongol Invasion. میں بھی موجود ہے۔ اب اگر ہمارے دلایل سے وہ نتیجہ غلط قرار پائے تو ظاہر ہے کہ مسٹر بارتولڈ کے دلایل کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور نہ اُن کے نہ جاننے سے کوئی حرج ہے۔

لفظ التتمش کی صحیح قرأت معین کرنے کے ہمارے پاس تین ذریعے ہیں:۔

(۱) کتبے۔ (۲) سکّے۔ (۳) تاریخیں اور دوسری تصانیف جن میں کسی نہ کسی سلسلہ میں یہ لفظ مذکور ہوا ہے سب سے پہلے ہم کتبوں کو لیتے ہیں:۔

(۱) عہد شمسی کا قدیم ترین کتبہ وہ ہے جو پلول[1] کی عیدگاہ (مسجد) کی درمیانی محراب کے اوپر نصب ہے اور جس میں تاریخ تعمیر جمادی الاولیٰ ۶۰۸ھ تحریر ہے۔ اس کا فوٹو (Epigraphia Indo-Muslemica)

---

[1] پلول۔ ضلع گوڑگاؤں (پنجاب) میں ایک قصبہ ہے۔

(مرتبہ ڈاکٹر ہارووٹز ۱۹۱۱-۱۲ء) میں شایع ہوچکا ہے۔ اس کی عبارت کا ایک حصہ درج ذیل ہے:-

"کہف الملوک والسلاطین ابوالمعالی التمش القطبی ....."

(۲) دوسرا کتبہ ۶۲۰ھ کا ہے جو جامع مسجد بدایوں کے مشرقی دروازہ پر نصب ہے[1]۔ اس میں سلطان کا نام اس طرح تحریر ہے:-

"شمس الدین غیاث الاسلام والمسلمین اعدل الملوک والسلاطین ابوالمظفر التمش السلطانی"

(۳) تیسرا کتبہ ۶۲۷ھ کا ہے جو بلگرام میں محلہ سیدواڑہ کی مسجد کے صحن کی شمالی دیوار میں نصب ہے۔ اس کتبہ کے متعلق قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہارووٹز صاحب نے اس میں سلطان کا نام "التمش" پڑھا ہے حالانکہ انھوں نے اپی گریفیکا انڈو مسلیمیکا میں اس کا جو فوٹو دیا ہے اس میں صاف "التمش" پڑھا جاتا ہے اور ہر دو "ت" کے دندانے بالکل واضح ہیں۔

(۴) چوتھا کتبہ جس پتھر پر کندہ ہے وہ اسوقت کلکتہ میوزیم میں موجود ہے اس میں سلطان کا نام "التمش" لکھا ہے۔ اس کی تاریخ تحریر سنہ ثلث وثلثین وستمایۃ (چھ سو تیس اور کچھ) ہے[1]۔

اس کے بعد قطب مینار کے کتبے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:-

(۵) قطب مینار۔ دوسری منزل۔ بالائے دروازہ۔ اس کتبہ میں سلطان کا نام "التمش" تحریر ہے[2]۔

(۶) قطب مینار۔ دوسری منزل، سب سے نیچے کی پٹی۔ اس میں بھی کتبہ نمبر ۵ کی طرح "التمش" لکھا ہے[3]۔

(۷) قطب مینار۔ تیسری منزل۔ اس میں بھی کتبہ نمبر ۵ اور نمبر ۶ کی طرح "التمش" کندہ ہے[4]۔ کتبہ نمبر ۵، نمبر ۶ اور نمبر ۷ کے جو فوٹو اپی گریفیکا میں دئے ہوئے ہیں اُن میں یہ لفظ صاف "التمش" پڑھا جاتا ہے لیکن سرسید مرحوم نے آثارالصنادید میں ان کتبوں کی جو نقل نستعلیق خط میں لکھی ہے اُس میں اس لفظ کی شکل "التمش" اختیار کی ہے۔ حالانکہ خود اسی کتاب میں ان کتبوں کے جو نقشے دئے ہوئے ہیں ان میں اس لفظ کو بخوبی "التمش" پڑھا جاسکتا ہے۔ آثارالصنادید کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے ایڈیشن میں سرسید نے "التمش" ہی لکھا ہو جو اب کاتب کی عنایت سے التمش ہوگیا۔

(۸) آٹھواں کتبہ سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان ناصرالدین محمود کا ہے جو ہانسی کی عیدگاہ کی مغربی دیوار میں نصب ہے۔ اس کی دوسری سطر یہ ہے[5]:-

"ناصرالدنیاوالدین ابوالفتح محمود بن السلطان السعید شمس الدنیاوالدین ابی المظفر التمش السلطان.."

(۹) نمبر ۹۔ یہ کتبہ خود سلطان شمس الدین کا ہے۔ پہلے اودھ میں ایک محراب پر نصب تھا اب دہلی میوزیم میں

---

[1] دیکھو اپی گریفیا۔ مرتبہ ہارووٹز ۱۹۱۱-۱۲ء ــــ [1] [2] [3] [4] [5] دیکھو حوالہ بابت کتبہ نمبر ۲

محفوظ ہے۔ اس میں بھی سلطان کا نام التمش تحریر ہے[۵۱]۔

(۱۰) نمبر ۱۰۔ اجمیر۔ اڑھی دین کا جھونپڑا۔ درمیانی محراب کے اوپر۔ اس کتبہ میں بھی التمش کندہ ہے[۵۲]۔

(۱۱) نمبر ۱۱۔ اجمیر کی مسجد کے شمالی منارہ کی نچلی پٹی پر جو کتبہ درج ہے اس کا ایک حصہ ابھی تک پڑھا جاتا ہے اور وہ عبارت یہ ہے:۔

"سلطان السلاطین الشرق ابوالمظفر التمش السلطانی ناصر امیر المومنین"

جنرل کننگھم صاحب نے (Archaeological Report) بابت ۱۸۶۴-۶۵ء میں اس کتبہ کا نقشہ بھی دیا ہے اس میں یہ لفظ نہایت صاف التمش لکھا ہوا ہے یہاں تک کہ ہر دو "ت" کے الگ الگ نقطے بھی موجود ہیں۔ پھر بھی جنرل صاحب موصوف نے اس کو التمش ہی پڑھا[۵۳] اور دوسروں نے اسے تسلیم کیا[۵۴]۔

(۱۲) نمبر ۱۲۔ گنگا رامپور (مالدہ) میں ایک مسجد کی پشت کی دیوار میں یہ کتبہ موجود ہے اس کی تاریخ تحریر محرم ۶۴۷ھ ہے اور سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین کا لکھوایا ہوا ہے۔ اس کا فوٹو جو اپی گریفیکا انڈو مسلیمکا، بابت ۱۹۱۲-۱۳ء میں شایع ہوا ہے اس میں لفظ التمش صاف پڑھا جاتا ہے مگر غلام یزدانی صاحب نے اپی گریفیکا میں اس کی جو نقل درج کی ہے اس میں التمش تحریر کیا ہے اور اُس کے انگریزی ترجمہ میں (Tutmish) لکھا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اسقدر واضح عبارت کو یہ "ماہرین آثارِ عتیقہ" کس طرح غلط پڑھ لیتے ہیں۔

اِن بارہ کتبوں میں سے صرف ایک کتبہ نمبر ۲ ایسا ہے جس میں التمش تحریر ہے باقی سب میں التمش ہے۔ بہرحال "ت" مکرر ہونا ہر کتبہ سے ثابت ہے۔ اب صرف دو کتبے باقی ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے اور جو مغالطہ انگریزی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ پہلا کتبہ وہ ہے جو قطب مینار کی چوتھی منزل پر ہے اور دوسرا ملک پورمین سلطان شمس الدین کے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کے مقبرہ کے پھاٹک پر لکھا ہوا ہے۔ ان دونوں کتبوں کے فوٹو جو اپی گریفیکا میں دئے ہوئے ہیں، صاف نہیں۔ اس لئے عبارت اچھی طرح پڑھی نہیں جاتی۔ ہارووٹز صاحب نے ان دونوں میں لفظِ زیر بحث کو "التمش" پڑھا ہے۔ اور قطب مینار کے اس کتبہ میں سر سید نے بھی التمش ہی پڑھا ہے۔ یعنی صرف ایک "ت" کے ساتھ۔ مگر مجھے ان بزرگوں کی رائے سے اتفاق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان حضرات کے پڑھنے کی غلطی ہے۔ میرے دعوے کی تائید نہ صرف مذکورۂ بالا بارہ کتبوں سے ہوتی ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ ان دونوں بزرگوں نے اور اِن کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی کتبوں کے پڑھنے میں حیرت انگیز غلطیاں کی ہیں جن کی طرف میں نے جابجا اشارے کر دئے ہیں اور قارئین اِن

---

۵۱ ۵۲ - دیکھو حوالہ بابت کتبہ نمبر ۲ ۵۳ دیکھو کننگھم صاحب کی آرکیولاجیکل رپورٹ بابت ۱۸۶۴-۶۵ء
۵۴ دیکھو ٹامس صاحب کی تاریخ۔ صفحہ ۸۰

کتبوں کے فوٹو دیکھ کر خود بھی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے پاس ایک اور بھی قطعی دلیل اس امر کی موجود ہے کہ حرف "ت" کو مکرر ہونا چاہئے اور اس دلیل کو ہم اس کے محل پر بیان کریں گے۔ الغرض ان کتبوں سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ سلطان کے نام کی تحریری شکل ایلتمش یا التمش ہے۔

کتبوں کے بعد سکوں کا نمبر ہے۔ سلطان شمس الدین ایلتمش کے بہت سے مختلف اقسام کے سکے خود ہندوستان کے مختلف عجائب خانوں میں اور کتنے ہی برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں۔ یہ سب سکے دو قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:۔

ایک وہ جن پر لفظ ایلتمش یا التمش صاف لکھا ہے اور یہی پڑھا بھی گیا ہے۔ دوسرے وہ جن پر لکھا تو ایلتمش یا التمش ہی ہے لیکن پڑھنے والوں نے ایلتمش یا التمش پڑھا ہے۔ سطور ذیل میں ہم نے ہر دو قسم کے مختلف سکوں سے بحث کی ہے اور نمونہ کے طور پر وہ سکے پیش کئے ہیں:۔

(۱) جو انڈین میوزیم کلکتہ میں محفوظ ہیں اور جن کی فہرست مسٹر رائٹ (Wright) نے مرتب کی ہے۔

(۲) جن کا ذکر ٹامس (Thomas) صاحب نے اپنی کتاب The Chronicles of the Pathan Kings of Delhi میں کیا ہے۔

(۳) جن کے متعلق مسٹر (Hoernle) نے جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۸۱ء میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔

(۴) جن کا حال مسٹر راجرس (Rodgers) نے جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ بابت ۱۸۸۰ء۔ ۱۸۸۳ء۔ ۱۸۸۶ء اور ۱۸۹۴ء میں تحریر کیا ہے۔

مندرجِ ذیل فہرست اُن سکوں کی ہے جن میں "ایلتمش" تحریر ہے۔ انڈین میوزیم۔ کلکتہ۔ سکہ نمبر ۳۲۔ نقرئی[1] انڈین میوزیم۔ کلکتہ۔ سکہ نمبر[2] ۵۲-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۲-۶۳-۶۵-۶۶-

(یہ سب سکے چاندی اور تانبا ملا کر بنائے گئے ہیں)

جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔ بابت ۱۸۸۰ء صفحہ ۲۰۹۔ سکہ نمبر ۶-۷-۱۰-۱۱-۱۲-

" ۱۸۸۳ء صفحہ ۸۵۔ سکہ نمبر ۱۶

" ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۸۶ سکہ نمبر ۲

" ۱۸۹۴ء صفحہ ۶۹۔ سکہ نمبر ۲۶

---

[1] Hoernle صاحب نے "التمش" پڑھا۔ دیکھو J.A.S.B. ۱۸۸۱ء صفحہ ۵۵

[2] انڈین میوزیم۔ کلکتہ۔ کے سکوں کے جو نمبر دئے گئے ہیں وہ اُس فہرست کے نمبر ہیں جو (Wright) صاحب نے مرتب کی ہے۔

اس کے بعد ان سکوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے جن میں التمش تحریر ہے۔

انڈین میوزیم۔ کلکتہ۔ سکہ نمبر ۲۳۔ ۳۵[1]۔ ۳۸[2]۔ ۳۹[3] (یہ سب سکے نقرئی ہیں)

انڈین میوزیم۔ کلکتہ۔ سکہ نمبر ۵۴[4] (چاندی اور تانبا ملا ہوا)

سکہ نمبر ۹۳[4] (نقرئی) یہ سکہ رضیہ سلطان بنت شمس الدین التمش کا ہے۔

ٹامس صاحب کے سکے:۔ سکہ نمبر ۲۹۔ (نقرئی)

سکہ نمبر ۴۶۔ (چاندی اور تانبا ملا ہوا)

سکہ نمبر ۹۵ (طلائی)

جنرل۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ بنگال۔ بابت ۱۸۸۰ء صفحہ ۲۰۸۔ سکہ نمبر ۹

" " ۱۸۸۱ء۔ صفحہ ۵۸۔ سکہ نمبر ۵[5]۔ یہ سکہ بھی رضیہ سلطانہ کا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش کا ایک سکہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انڈین میوزیم۔ کلکتہ کی فہرست میں اس کا نمبر (۱۱م) اکتسالیس ہے اس میں ایک طرف "السلطان التمش" اور دوسری طرف ہندی میں "सी हुलतान लितितिमि" تحریر ہے۔ رائٹ صاحب نے ہندی میں سلطان کا نام "सितितिमिसि" پڑھا اور دوسری جانب "التمش" صحیح پڑھا۔ اس کے برعکس ٹامس صاحب نے التمش کو التمش بنا دیا۔ مگر ہندی تحریر کو صحیح پڑھا۔ ٹامس صاحب کا اسی قسم کا ایک سکہ جو برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔ اور مجھے ٹامس صاحب کی ہندی تحریر کی قرائت "लितितिमिसि" سے کلی اتفاق ہے۔ غرض اس ہندی تحریر سے بھی دو "ت" کا ہونا ثابت ہے۔

---

[1] ٹامس صاحب کے نقشہ میں صاف التمش پڑھا جاتا ہے لیکن رائٹ صاحب نے التمش پڑھا۔ ٹامس صاحب نے التمش صحیح پڑھا۔

[2] (Hoernle) صاحب نے التمش پڑھا حالانکہ خود اُن کے اپنے نقشہ میں نیز رائٹ صاحب کے فوٹو میں التمش صاف پڑھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فوٹو میں تو ہر دو "ت" کے نقطے بھی موجود ہیں۔

[3] (Hoernle) صاحب کے نقشہ میں التمش صاف پڑھا جاتا ہے مگر رائٹ صاحب نے التمش پڑھا۔ ٹامس صاحب نے یہاں بھی التمش صحیح پڑھا۔

[4] Hoernle صاحب نے التمش پڑھا۔ ٹامس صاحب کے نقشہ میں اور رائٹ صاحب کے فوٹو میں التمش صاف تحریر ہے اور رائٹ صاحب اور ٹامس صاحب دونوں نے التمش صحیح پڑھا۔ دیکھو جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۸۸۱ء صفحہ ۵۷۔

[5] Hoernle صاحب کے نقشہ میں التمش پڑھا جاتا ہے مگر خود انھوں نے التمش پڑھا۔ دیکھو حوالۂ بالا۔

اس مضمون کے دوران تحریر میں مجھے سلطان شمس الدین کے ایک اور سکہ کا پتہ چلا جو ڈھاکہ میوزیم میں موجود ہے۔ میں نے اسے بھی دیکھا۔ اور اس پر بھی "ایلتمش" صاف تحریر ہے۔ سکوں کے ان تمام ذخیروں میں جن کی تفصیل بیان کیگئی مجھے ایک سکہ بھی ایسا نہیں ملا جس پر صاف ایلتمش یا التمش لکھا ہوا ہو۔ اگر بعض سکوں میں بعض ماہرین سکہ جات نے ایلتمش یا التمش پڑھا تو وہ خود ان کے پڑھنے کی غلطی ہے۔ ٹامس صاحب نے اپنی کتاب (کرانیکلس) میں نمبر ۵۰ کے ماتحت جس سکہ کا ذکر کیا ہے اس میں خود اُن کے نزدیک ایلتمش تحریر ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نہ تو مجھے بذات خود اس سکہ کے دیکھنے کا موقع ملا نہ اس کا فوٹو دستیاب ہو سکا جو اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہا جا سکے۔ مگر ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ بھی ٹامس صاحب کے پڑھنے کی غلطی ہے۔ اگر آئندہ کوئی ایسا سکہ دریافت بھی ہو جائے جس پر ایلتمش یا التمش صاف تحریر ہو تو پیشِ نظر شواہد کی موجودگی میں اُسے یقیناً سکہ ساز کی غلطی تسلیم کرنا پڑے گا۔

کتبوں اور سکوں کے بعد تاریخوں اور دوسری کتابوں کا نمبر ہے۔ جیسا کہ میں بیشتر بیان کر چکا ہوں مختلف کتابوں میں اس لفظ کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ یہ اختلاف مصنفین کے اختلاف رائے کی بنا پر نہیں بلکہ کاتبوں کی نا واقفیت اور غفلت کا نتیجہ ہے کسی کتاب کا کوئی قلمی نسخہ جب تک خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ ہو یا کسی دوسرے ذریعہ سے اسی درجہ مستند نہ تسلیم کر لیا گیا ہو کسی لفظ کی صحیح قرأت معین کرنے میں ہمیں کچھ بہت زیادہ مدد نہیں دے سکتا۔ بہر حال یہاں چند اہم کتابوں کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ قارئین کو ان کے اختلافات کا اندازہ ہو جائے۔

چار کتابیں سلطان شمس الدین ایلتمش کے معاصرین کی تصنیف اسوقت دنیا میں موجود ہیں:-

(۱) طبقاتِ ناصری۔ تالیفِ منہاجِ سراج۔ جس کے مختلف نسخوں میں سلطان کے نام کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں اور جس کی کچھ تفصیل ریورٹی صاحب، (نمبر ۲۱) کے ذکر میں بیان کی جا چکی ہے۔

(۲) تاریخ جہانگشائے نادری۔ تالیف علاء الدین عطا ملک جوینی۔ سنہ تالیف ۶۵۸ھ اس کتاب کے متعدد نسخے پیرس کے کتبخانہ ملی میں میری نظر سے گزرے۔ سب سے قدیم نسخہ جو ۶۹۹ھ میں لکھا گیا ہے یعنی مصنف کی وفات کے کل آٹھ سال بعد۔ اس میں "التمش" درج ہے یعنی پہلی "ت" پر نقطے نہیں ہیں۔ باقی نسخوں میں ایلتمش یا التمش تحریر ہے۔

(۳) کامل التواریخ۔ تالیف ابن الاثیر۔ کامل التواریخ کا مصری ایڈیشن جو میرے پیش نظر ہے اس کی بارھویں جلد میں، ۶۱۲ھ کے واقعات کے ماتحت، "الدز" کے لاہور فتح کرنے اور بعد ازاں سلطان شمس الدین کے ہاتھوں قتل ہونے کے ذکر میں، سلطان کا نام "الترمش" لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اول کتابت کی اور بعد ازاں ٹائپ کی غلطی ہے۔

(۴) آداب الحرب والشجاعۃ۔ تالیفِ محمد بن منصور بن سعید قریشی۔ ملقب بہ مبارکشاہ، معروف بہ فخر مدبر۔ یہ کتاب خود سلطان شمس الدین کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس وقت دنیا میں اس کے صرف دو ہی نسخے موجود ہیں اور وہ دونوں راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ برٹش میوزیم لندن کے نسخہ میں ایلتمش

اور انڈیا آفس لندن[1] کے نسخہ میں التمش تحریر ہے۔

ان کتابوں کے بعد قریب العہد تاریخوں کا نمبر ہے۔

(۱) جامع التواریخ۔ تالیف رشید الدین فضل اللہ۔ زمانِ تالیف از ۷۰۰ھ تا ۷۱۰ھ۔ برٹش میوزیم کے قلمی نسخہ میں التمش تحریر ہے۔

(۲) تاریخ وصاف۔ تاریخ تالیف ۷۱۲ھ[2]۔ جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا برٹش میوزیم کے قلمی نسخہ میں التمش تحریر ہے۔

(۳) تاریخ بناکتی۔ تالیف ابو سلیمان داؤد۔۔۔۔ البناکتی۔ سال تالیف ۷۱۷ھ۔ برٹش میوزیم کے قلمی نسخہ میں "ایل تمیش" تحریر ہے۔

دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں بہت سی اہم تاریخیں فارسی میں لکھی گئیں جن میں سے روضۃ الصفا — خلاصۃ الاخبار۔ نسخ جہاں آرا۔ تاریخ ایلچی نظام۔ مراۃ الادوار۔ تاریخ صدر جہاں گجراتی۔ تاریخ مبارکشاہی وغیرہ کے قلمی نسخے یورپ کے کتبخانوں میں راقم کی نظر سے گزرے ہیں اور ان سب میں لفظِ "التمش" کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں — یہاں تک تو جو کچھ بیان ہوا، اس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اس لفظ کی صحیح شکل تحریری التمش یا التمش ہے مگر ابھی اس کے اعراب اور حرکات و سکون کی تحقیق باقی ہے اس مقصد کے لئے سب سے پہلے اس کے وزنِ عروضی[3] کی تعیین ضروری ہے۔ کسی لفظ کا وزنِ عروضی دریافت کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اُسے کہیں کسی شعر میں تلاش کیا جائے، رضیہ سلطانہ کے قید ہو جانے کے بعد جب اس کا بھائی معز الدین بہرام شاہ بن سلطان شمس الدین التمش تخت نشین ہوا تو منہاجِ سراج، مولفِ طبقات ناصری نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا تھا جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

زہے در شانِ تو منزل نزولِ آیات قرآنی ببیں در رایتِ شاہی علاماتِ جہانبانی

آگے چلکر کہتا ہے:۔

---

[1] انڈیا آفس کے نسخہ میں کتاب کا نام آداب الملوک و کفایت المملوک تحریر ہے۔

[2] پانچویں جلد بعد میں لکھی۔ غالباً ۷۲۸ھ میں۔

[3] وزنِ عروضی۔ وزن کی کئی قسمیں ہیں جیسے وزنِ عروضی، وزنِ صرفی۔ وزنِ موسیقی، اور اس کے سوا اعتدال بھی ایک وزن ہے۔ وزنِ عروضی سے یہ مراد ہے کہ دو لفظوں کے حرکات و سکنات متقابل اور مساوی ہوں جیسے "کاغذ" اور "ساقی" میں جس طرح "کاغذ" کا پہلا حرف متحرک، دوسرا ساکن، تیسرا متحرک، اور چوتھا ساکن ہے۔ اسی طرح "ساقی" کا بھی پہلا حرف متحرک، دوسرا ساکن تیسرا متحرک اور چوتھا ساکن ہے۔ لیکن وزنِ صرفی کے لئے ضروری ہے کہ حرکات و سکنات نہ صرف مساوی بلکہ مطابق بھی ہوں جیسے "پجاری" اور "اداسی" میں۔ کہ دونوں کا پہلا حرف مضموم۔ دوسرا مفتوح اور چوتھا مکسور ہے اور تیسرا اور پانچواں حرف ساکن ہے۔

(ا) اگر سلطانیِ ہند است ارثِ دودۂ شمسی — بحمداللہ زفرزنداں توئی التمش[1] ثانی ،،
مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن — مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن

پھر جب سلطان ناصرالدین محمود کی تخت نشینی کی نوبت آئی تو منہاجِ سراج نے یہ قصیدۂ مدحیہ پیش کیا:-

(ب) آل شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است — ناصرِ دنیا و دیں محمود بن التمش است
فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلان — فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلان[2]

سلطان ناصرالدین محمود ہی کے عہد میں (۶۵۸ھ میں) ترکستان کے ایلچیوں کی باریابی کے موقع پر دہلی میں ایک زبردست جشن ترتیب دیا گیا تھا۔ اس تقریب پر منہاج سراج نے یہ قطعہ کہا تھا:-

زہے جشنے کزو اطراف چوں خلدِ بریں گشتہ — خہے بزمے کزو اکناف عدلِ راستیں گشتہ

آگے چلکر کہتا ہے:-

(ج) زفرِ ناصرالدین شاہ محمود ابنِ التمش[3] — ملک نزدش دعا خواندہ، فلک پیشش زمیں گشتہ
مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن — مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن

ان اشعار کی تقطیع کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ لفظ "التمش" تین[3] دو سببِ خفیف[4] کا مجموعہ ہے (یعنے اِلْ۔ تِتْ۔ مِشْ۔) یا بالفاظِ دیگر مفعولن کا ہموزن ہے۔

بعض ناواقف اس محل پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے شاعر نے بضرورتِ شعری لفظ التمش میں کچھ کمی بیشی کر دی ہو۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بضرورتِ شعری اسمائے عَلَم میں کمی تو کر لی جاتی ہے مگر اضافہ نہیں کیا جاتا اور کمی بھی صرف ایسی صورت میں کی جاتی ہے کہ مثلاً شاعر کوئی بہت بڑی نظم (مثلاً کوئی مثنوی) کسی خاص بحر میں لکھ رہا ہے اور اُس بحر میں وہ نام نہیں آسکتا تو ناچار نام میں کچھ قطع و برید کی جاتی ہے کیونکہ اُس نام کی خاطر پوری نظم یعنی پوری کتاب کی بحر کو نہیں بدلا جا سکتا۔ لیکن مدحیہ قصائد یا قطعات میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ممدوح کا نام بصورتِ اصلی قایم رہے اور صرف ایسی بحریں اختیار کی جاتی ہیں جن میں ممدوح کا صحیح نام بسہولت نظم ہو سکے۔ اس لئے منہاج کے اشعارِ مذکور پر اس قسم کا شبہ کسی طرح درست نہیں خصوصاً جبکہ تینوں شعروں میں لفظ التمش کی ایک ہی وزن اور ایک ہی صورت قرار پاتی ہے۔

---

[1] [2] [3] طبقاتِ ناصری مطبوعۂ کلکتہ میں تینوں جگہ التمش تحریر ہے اور تیسرے شعر میں "ابن" کی جگہ "بن" ہے اڈیٹر صاحب نے اس امر کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ "التمش" اور "بن التمش" ہونے سے شعر ساقط الوزن ہو جائے گا۔

[2] فاعلان کی جگہ فاعلات بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق وزن میں نہیں ہوتا۔

[4] عروضیوں کی اصطلاح میں "سببِ خفیف" ایسے دو حرفی کلمہ کو کہتے ہیں جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہو جیسے "دِل"

وزنِ کی تعیین کے بعد اب ہمیں لفظ "التمتمش" کے اعراب معلوم کرنا ہیں اس کے مرکب اجزائے ہجائی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی۔ ال۔ تت۔ مش۔ اعراب کی تحقیق ہم آخری جزو "مش" سے شروع کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مثال (ج) یعنی شعر نمبر ۳ میں التمتمش، کو ش کا ہمقافیہ واقع ہوا ہے اور قطعہ کے دوسرے قوافی بخشش، رامش وغیرہ ہیں چونکہ ان تمام الفاظ میں حرفِ "ش" کا ماقبل مکسور ہے اس لئے "التمتمش" کا "م" بھی مکسور ہوا۔

اب جزو دوم کو لیجئے۔ "تت" کی پہلی "ت" کا مکسور ہونا اُن تحریروں سے ثابت ہے جو ہندی خط میں سلطان شمس الدین کے سکوں پر منقوش ہیں اور جن کا ذکر سکوں کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ کتبوں اور سکوں کی عبارتیں جو عربی اور فارسی خط میں تحریر ہیں اور اعراب سے معرّا۔ اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ لیکن ہندی تحریر میں اعراب کا ہونا لازمی ہے اور یہ جزو سات तिति (تِت) لکھا ہے۔ یعنی "ت" مکسور ہے۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اسے "تَت" یا "تُت" پڑھا جائے۔ جیسا کہ اکثر مستشرقین نے کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ہندی کی تحریر "ت" کے مکسور ہونے کا ایک ایسا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں اور اب بھی اگر کسی کو اس کلمہ کے "تَت" یا "تُت" ہونے پر اصرار ہو تو وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کے بارہ بجے یہ کہے کہ "کیسی اندھیری رات ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا"۔

زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ तिति کے بجائے तित کیوں تحریر ہے یعنی دوسری "ت" کو متحرک کیوں لکھا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس "ت" کے بعد جو "م" ہے وہ خود متحرک ہے اس لئے اس "ت" کی حرکت تلفظ میں بہت خفیف رہ جاتی ہے۔ اسقدر خفیف کہ التمتمش کے سکہ کی ہندی ڈائی بنانے والے اس حرکت اور سکون میں امتیاز نہ کر سکے۔ چنانچہ سلطان معزالدین محمد بن سام[1] کے ان سکوں میں جن پر سلطان کا نام ہندی[2] میں لکھا ہوا ہے لفظِ "بن" ہندی میں बिन्न تحریر ہے بہرحال سکہ ساز کی اس جزئی غلطی سے کسرہ اور ضمہ کی تمیز، تحقیق اور تعیین میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "تت" کی پہلی "ت" مکسور ہے۔

التمتمش کے دوسرے جزو "تمش" اور تیسرے جزو "مش" کے اعراب کی تعیین کے بعد اب فقط ابتدائی "الف" کی حرکت کا معین کرنا باقی رہ جاتا ہے لیکن "الف" کی حرکت معلوم کرنے سے قبل ایک ضروری مسئلہ کی تشریح نہایت ضروری ہے قارئین کو بار بار یہ خیال آ رہا ہوگا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں اس لفظ کی تحریری شکل "التمتمش" اختیار کی گئی اور بعد میں اُسے "التمتمش" سے بدل دیا گیا اور اشعار کی مدد سے اس لفظ کا جو وزن معین کیا گیا اس سے بھی یہی شکل یعنی "التمتمش" ثابت ہو چکی ہے، تو آخر یہ "ی" کہاں چلی گئی۔ اس کا ذکر کیوں نہیں آتا۔ کیا یہ لفظ التمتمش کا کوئی اصلی جزو نہیں ہے۔

---

[1] ہندوستان میں سلطان معزالدین عام طور پر سلطان شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے کیونکہ پہلے اس کا لقب شہاب الدین ہی تھا۔

[2] دیکھو فہرست سکہ جاتِ اسلامی۔ انڈین میوزیم کلکتہ۔ سکہ نمبر ۱

یہاں پر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ترکی رسم الخط میں اکثر الفاظ کے حرکات یعنی زیر، زبر، پیش، کو علی الترتیب "ی"۔ "الف"۔ اور "و" یعنی حروفِ علت سے ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً ترکی لفظ اُرْدُک (مُرغابی) پہلا حرف یعنی "الف" مضموم ہونے کی وجہ سے "اوردک" لکھا جاتا ہے لیکن اس کا تلفظ اُرْدُک ہے۔ اسی طرح یارُق (دستبند) کو "یاروق" لکھتے اور "یارُق" پڑھتے ہیں۔ اس رسم الخط کا کچھ اثر آج بھی ہمیں اُردو کے مصدر "پہونچنا" (پہنچنا) اور اُسکے مشتقات میں نظر آتا ہے ——— اور اُنیسویں صدی کے بعض بزرگ آج بھی ایسے موجود ہیں جو "اُس" کو "اوس" لکھتے ہیں۔

جس طرح "و" علامتِ ضمہ ہے اسی طرح "ی" علامت کسرہ ہے۔ چنانچہ ترکی میں "ایلغون"[1] لکھتے اور "اِلغُون" بولتے ہیں۔

ایلغار لکھتے اور "اِلغار" پڑھتے ہیں۔

ایکدش (اکدش)۔ ایلدکز (الدکز)۔ ایلغم صالغم[2] (اِلغم صلغم) اسی قبیل کے الفاظ ہیں اور اس کی بکثرت مثالیں ترکی لغات میں مل سکتی ہیں۔ ہندوستان کے جن لغت نویسوں نے ترکی رسم الخط کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا اور صرف تلفظ کو معتبر جانا انھوں نے "ی" کو حذف کر دیا چنانچہ موید الفضلا میں آپ کو ایلغار، ایکدش ایلدکز بدونِ "ی" یعنی الغار، اِکدش، اور الدکز لکھے ہوئے ملیں گے۔ لیکن ترکی کے لغات میں "ی" کو حذف نہیں کیا گیا۔

اسی طرح ایلتمش (جو ایک ترکی لفظ ہے) کی "ی" بھی کسرۂ الف کی علامت اور غیر ملفوظ ہے۔ اس تشریح سے ثابت ہوگیا کہ اِلتمش کا الف مکسور ہے اور پورے لفظ کا صحیح تلفظ "اِلْ۔ تِتْ۔ مِشْ" ہے۔ اب چاہے کوئی التمش لکھے یا ایلتمش، تلفظ بہر صورت "اِلْ تِتْ مِشْ" ہی رہیگا۔ لیکن چونکہ یہ ایک ترکی لفظ ہے اس لئے ترکی رسم الخط کا لحاظ کرتے ہوئے ایلتمش لکھنا میرے نزدیک اصح ہے۔

عندلیب شادانی

---

[1] ایلغون ترکی میں الی کو کہتے ہیں۔ [2] بمعنی سراب

تذکرۂ معرکۂ سخن

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں۔ فن شعر و انشاء کے لئے عجیب چیز ہے

قیمت معہ محصول عہ۔

مینجر نگار

ہندوؤں کا علم الاصنام

(اڈیٹر نگار کی چوتھی تقریر جو ۳۰ اگست کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

کرۂ زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس کا افسانہ سرزمین ہند سے زیادہ دلچسپ و حیرت انگیز ہو۔ اگر تہذیب و مدنیت کی دنیا میں، افریقہ اپنے دریائے نیل کی وادیوں پر اور مشرقِ ادنیٰ دجلہ و فرات سے سیراب ہونے والی زمین پر فخر کر سکتا ہے تو مشرقِ بعید بھی، مصر و بابل کے دوش بدوش، ہندوستان کے ان میدانوں، کوہستانوں اور وادیوں کو پیش کر سکتا ہے، جہاں آریہ قوم عہدِ قدیم کے اس دور میں جب روما و یونان کی تہذیب مستقبل بعید کی تاریکی میں معدوم تھی، جب طرائی اور منا کی بنیاد کو بھی دنیا نے قبول نہ کیا تھا، جب داؤد کے نغموں سے دنیا ناآشنا تھی، جب ہومر کے گیتوں سے زمانہ آگاہ نہ تھا، جب کہ مسیح کی پیدائش کو پورے چار ہزار برس باقی تھے، جبکہ ابراہیم خلیل اللہ کسی بتکدہ کو توڑ کر دین حنیف کی بنیاد ڈالنے کے لئے دنیا میں نہ آئے تھے، اُس قدیم عہد میں بھی اگر آریہ قوم کے مرد ایک طرف لوائے فتح و نصرت بلند کئے ہوئے تھے تو دوسری طرف ان کی عورتیں اپنے بچوں کو وہ کہانیاں اور لوریاں سنایا کرتی تھیں جو بعد کو روما و یونان کے علم الاصنام کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں، پھر کسقدر عجیب بات ہے کہ اصنامی روایات روما و یونان، مصر و عرب ہر جگہ پائی جاتی ہیں لیکن جو خصوصیت ہندو علم الاصنام کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ تمدن و تہذیب کا وہ دور جس میں نسل انسانی کی طفلی، پختگی، وقتِ نظر، معصومیت، رمز شناسی اور مفکرانہ اوہام پرستی سب ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں، صرف ہندو علم الاصنام ہی میں ہم کو نظر آتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تاریخ انسانی کا وہ لمحہ جس میں آفتاب کا طلوع، اُس کا عروج و زوال، شام کی شفقی رنگینیاں، سنسان رات کی خاموش لذتیں، سب یکجا نظر آتی ہیں، ہندو علم الاصنام کی حقیقی روح ہے، اس کی عملی زندگی اور وجدانی احساس کا وہ صحیح امتزاج، جہاں حواسِ ظاہری کے ساتھ دل و دماغ بھی ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور جہاں حقیقت و مجاز کی بحث بالکل بیکار ہو جاتی ہے وہ عجیب و غریب خصوصیت ہندو علم الاصنام کی ہے جو کسی اور ملک کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔

علم الاصنام کی تخلیق تین درجے رکھتی ہے، پہلا درجہ تخییل محض کا ہوا کرتا ہے، اُس کے بعد دوسری منزل وہ ہے جب واہمۂ انسانی اپنے تصرفات سے کام لیتا ہے اور تیسرا درجہ اس ارتقار کا ہے جب اُس میں گہرائی اور معنویت پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر آپ جس قوم کے علم الاصنام کا مطالعہ کیجئے ظاہر سے باطن کی طرف، اور سطح سے اندرونیت کی طرف

ترقی کرنے کی صلاحیت سب میں پائی جائے گی، لیکن جس سج دھج سے ہندو علم الاصنام معنویت کی طرف بڑھا ہے اور جس انداز سے وہ آخر میں ماورا روہم وخیال اور ماورا تاریخ وحقیقت ہو کر محض ایک روحانی و وجدانی رمز ہو کر رہ گیا ہے، وہ آپ کو کسی اور جگہ نظر نہ آئے گا۔

یونانی تہذیب میں چند مفکر ضرور پیدا ہوئے لیکن گیان دھیان کی وہ فضا جو ہندو تہذیب نے اپنے لئے تخلیق کی اور جس میں اُسے پختگی کا موقع ملا صرف اُسی کے لئے مخصوص تھی۔ اس کی تشکیل وتکمیل کی یہ خصوصیت کہیں اور نہیں مل سکتی کہ اُسکے مرئیات میں غیر مرئی ابدیت نظر آتی ہے، اُس کے مادیات میں روحانیات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اُس کے لب ولہجہ میں ایک خاص خاموشی ہے، اُس کے ہنگامہ میں ایک خاص سکون ہے، اُس کے تار وپود میں ایک خاص مفہوم کا راز پوشیدہ ہے اور اُس کی ہیئت ترکیبی میں (Centrifugal & Centripetal) یعنی مرکز کی طرف میلان و اجتناب دونوں خصوصیتیں یکجا نظر آتی ہیں۔

رومن ویونانی علم الاصنام کے ابتدائی دور میں ضرور اس نوع کی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن بعد کو معنویت مفقود ہو گئی اور اُس کا فریب نظر ہندو متھالوجی کی طرح مشاہدات کی صورت اختیار نہ کر سکا مثلاً یونانی علم الاصنام کے کیوپڈ سے ہندوؤں کے کامدیو کا مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ لذات نفسانی کو مقصود زندگی قرار دیتا ہے اور یہ اُسے مایا یا فانی بتا کر حسن اخلاق کی طرف مائل کرتا ہے۔

وینس یونانیوں کی مشہور حسن وجمال کی دیوی کے مقابلہ میں ہندو علم الاصنام لکشمی کو پیش کرتا ہے دونوں کی پیدائش سمندر سے ہوئی ہے اور دونوں کا تعلق نشاط زندگی سے ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وینس کا کیرکٹر انسان کے صرف سطحی جذبات تعیش کو اُبھارتا ہے اور لکشمی نوع انسانی کی خوشحالی وفارغ البالی کا ضامن ہے اور نسائیت کا تصوری پیکر۔

یونانیوں کا زیوس اور اہل روما کا جیوپٹر تقریباً وہی ہے جسے ہندوؤں میں اِندر کہا جاتا ہے لیکن وشنو، مہادیو، کرشن، اور رام کے مرتبہ کا کوئی دیوتا وہ پیدا نہ کر سکے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمان جن کی ذہنیت میتھالوجی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، ہندوؤں کو کافر بت پرست کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں اور عرب وہند کی بت پرستی میں بین فرق محسوس کرتے ہیں۔

بعض مسلمان صوفیہ نے ہندو عقاید میں وہ گہرائی پائی ہے جو اسلامی روحانیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اور ہو سکتا ہے کہ اسی احساس نے الفاظ "کفر و کافر" بت خانہ، ناقوس اور زنار وغیرہ میں وہ شوخ اور وجد آور کیفیت پیدا کر دی ہو جسکو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی متصوفانہ شاعری سے نکال دیجئے تو وہ بالکل بے آب و رنگ ہو جائے۔

غور کرنے سے اس امتزاج کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے یہودیوں کی طرح اپنے آپ کو Chosen People of God یعنی خدا کی برگزیدہ قوم سمجھ کر اس کی برکتوں کو صرف اپنے لئے مخصوص نہیں جانا اور

چونکہ ہندوستان کی زرخیز سرزمین اور معتدل آب و ہوا میں تنازع حیات کا مسئلہ چند صدیوں کے اندر ہی طے ہو گیا۔ اسلئے خوف و عناد کا احساس بھی یہاں جلدی محو ہو گیا اور مادر گیتی کا مفہوم یہاں نسل انسانی کے لئے ایک واقعیت و حقیقت ہو کر رہ گیا اور اسی چیز نے ہندو علم الاصنام کو وہ کیفیت عطا کر دی جو یونان و رومہ کی فضا اور دریائے نیل کے جزر و مد پر بھروسہ کرنے والی قوم میں پیدا نہ ہو سکی۔

یہاں کی انسانیت میں جو نرمی و پختگی پیدا ہوئی اور ہندو تاریخ و ہندو اجتماعیت میں معنویت کا جو رنگ چڑھا اُسکا اظہار مشکل ہے، البتہ ژانتی وغیرہ کے الفاظ سے ہمیں کچھ پتہ چلتا ہے کہ ہندو کلچر کیا چیز ہے، اور ان کا اخلاقی نشو و نما کس نوع کا ہے جس میں ان کی روایات اصنامی بھی آخر کار جذب ہو کر رہ گئیں۔

ہندو کلچر کی خصوصیت (Assimilation) ہے (Rejection) نہیں، یعنی وہ ہر چیز کو اپنے اندر ملا لیتا ہے، رد نہیں کرتا، جس گنگا کے دہانہ پر دین حجازی کے بیڑے کے ڈوبنے کا ماتم حالی نے کیا ہے اور اقبال کو جس چیز نے عجمیت و مجازیت کے درمیان حد فاصل قائم کرنے پر مجبور کیا وہ یہی ہندو ذہنیت تھی۔

جو قوم سانپ، بچھو اور پتھروں کو خدا مان کر اہم برہم (یعنی انا الحق) کی بلندیوں سے گزرتی ہوئی الحاد و دہریت کو بھی اپنی آغوش خیال میں لیلے، ظاہر ہے کہ وہ دیگر مذاہب یا اقوام کو اپنا باجگزار بنائے بغیر کیونکر رہ سکتی تھی۔ ہندو کلچر کسی چیز کو مٹاتا نہیں بلکہ اپنے اندر شامل کر کے اپنی تمام معنویت اُسے دیدیتا ہے اور یہ رنگ ہندوؤں کے علم الاصنام میں ہر جگہ نظر آتا ہے جسے امرسن (Sublimity of Ethical thought) یعنی تصورات اخلاق کی رفعت سے تعبیر کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندو دیوتاؤں کا شمار مشکل ہے اور اُن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے، لیکن ان سب کا تعلق طبیعی و جغرافی ماحول سے ہے یا پھر اُن خیالات سے جو ترقی تمدن کے سلسلہ میں ایک قوم کے سامنے آتے ہیں۔

اگر ہندوؤں کی اصنامی روایات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے اکثر کنائی و تمثیلی نظر آئیں گی۔ بعض کی تشکیل مناظر قدرت کے مطالعہ کا نتیجہ ہے، اور بعض انسان کے جذبات محبت و نفرت کی پیداوار ہیں۔ ان کے یہاں ایسی روایات بھی نظر آتی ہیں جو صرف معاشی و اقتصادی نظام کی پاکیزگی کو ظاہر کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو یا تو صرف شاعری کا نتیجہ ہیں یا فلسفہ و حکمت کا۔۔

ہندوؤں کے علم الاصنام میں رامائن و مہابھارت بڑے مرتبہ کی چیزیں ہیں، جن کے ذریعہ سے اخلاق و عمل کی نہایت بلند تعلیم دی گئی ہے، اسی طرح وہ روایتیں جو کرشن جی کی زندگی سے متعلق ہیں بہت گہرے اور وسیع معانی اپنے اندر رکھتی ہیں۔

بھگوت اور پرانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جن میں کوئی سیاسی یا معاشرتی درس دیا گیا ہے یا کوئی اخلاقی تعلیم کسی مثال کے ذریعہ سے پیش کی گئی ہے۔ مثلاً نل و دمن یا ساوتری و ستیاون کے قصے، کہ ایک میں قمار بازی کے خلاف تنبیہ کی گئی ہے اور دوسری میں محبت کی انتہائی وفاداریوں کو دکھایا گیا ہے۔

محض شاعرانہ تخیل کے سلسلہ کی روایات میں مرتیو (یعنی مرت) کی پیدائش اور کامدیو کا جلا دیا جانا بہت مشہور ہے۔ طبعی مناظر سے تعلق رکھنے والی روایتوں میں سمندر کے متھے جانے کی روایت مرکزی حیثیت رکھتی ہے جس سے اور متعدد روایات پیدا ہوئیں۔ مثلاً راہو اور کیتو کا قصہ، چاند اور سورج گرہن کی روایت موہنی کی کہانی کہ ان سب کی بیک گراؤنڈ میں درسِ اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔

الغرض کائنات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جو ہندو علم الاصنام میں شامل نہ ہو، حیوانات، نباتات اور جمادات سبھی کا مطالعہ اس قوم نے کیا اور اپنے تاثرات کو کسی نہ کسی رمز و کنایہ سے ظاہر کیا۔

دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا وجود بھی ہندو علم الاصنام میں پایا جاتا ہے اور نہایت اہم پہلو انسانی زندگی کے ان سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، مثلاً سرسوتی جو موسیقی، شاعری اور علم و فضل کی دیوی سمجھی جاتی ہے، یا لکشمی جو انسانی خوشحالی کی تمثال ہے یا ستیاجی جو نسائی اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں یا رادھا جی جو محبت و فدا کاری کی تصویر ہیں۔ اسی طرح پاربتی اور کالی وغیرہ متعدد اہم دیویاں ہندو علم الاصنام میں پائی جاتی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عورت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دنیاوی زندگی میں اُسے برابر کا شریک قرار دیتے تھے۔

ہندو پت کو تین دور میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلا وہ دور جو ویدوں سے تعلق رکھتا ہے، دوسرا رزمیہ دور جو رامائن اور مہابھارت میں پیش کیا گیا ہے اور تیسرا دور پرانوں اور تانتروں کا ہے جو علم الاصنام کا خاص دور سمجھا جاتا ہے درانحالیکہ ویدک دور بھی اصنامی خیالات سے خالی نہیں۔ رگ وید سب سے قدیم وید مانا جاتا ہے یعنی مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل لیکن اس میں بھی جو نغمہ ہائے عبادت درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو عناصر کی پرستش کرتا تھا، یعنی وہ اگنی کو پوجتا تھا جس سے مراد آگ اور آگ کی روشنی ہے (انگریزی لفظ Ignite کا ماخذ یہی لفظ ہے) وہ اِندر کی پوجا کرتا تھا جس سے مراد صاف فضاء آسمانی ہے۔ وہ ہوا کو ماروت کے نام سے پکارتا تھا، سورج کو سوریا دیوتا سمجھتا تھا اور طلوعِ صبح کو اوشاس۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ اُن کی پرستش خدا سمجھکر نہ کرتا تھا بلکہ اُن کو صرف خدا کی قوتیں جانتا تھا۔

رگ وید کی زبان و انشاء سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اُس وقت کائنات کے تخلیقی رموز دریافت کرنے کے لئے بیتاب تھا اور آخر کار جامع اضداد خیالات سے متاثر ہو کر اظہارِ عجز پر مجبور ہو جاتا تھا۔ یہی وہ سعی و کاوش تھی جو اپنیشدوں کی تصنیف کا باعث ہوئی، جس میں خدا اور اُس کے ساتھ انسانی تعلق کو عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رگ وید میں خدا کے متعلق جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے جو بعد کو اسلام نے پیش کیا یا بڑے بڑے مسلمان صوفیائے کرام نے۔ مسلمان شاعروں میں بیدل عظیم آبادی کا پورا مجموعہ گویا رگ وید کی تعلیم ہے۔ دوسرا دور جسے رزمیہ دور کہتے ہیں وہ ہندو کلچر کا نہایت ترقی یافتہ دور تھا جس نے تقسیمِ عمل کے اُصول پر ایک طرف فلسفہ و حکمت کے پرچار کرنے والے

علٰحدہ کر دئے تھے اور دوسری طرف عملی زندگی کا درس دینے والے۔ اِس دور میں فلسفہ ویدانت نے نشو و نما پایا اور اِسی زمانہ میں شیو دیوتا کی تخلیق ہوئی جس کا رقصِ موت دنیا میں زہر و امرت کو ایک چیز سمجھنے کا نہایت عمیق خیال پیش کرتا ہے۔

تیسرا دور پرانوں اور تانتروں والا ہندویت کا انحطاطی دور کہلاتا ہے، کیونکہ اس سے قبل جو یگانگت و صلح دیوتاؤں میں پائی جاتی تھی وہ اب مفقود ہو گئی تھی۔ برہما کی پرستش تقریباً ترک ہو چکی تھی اور شیو و وشنو کی جنگ شروع ہو گئی تھی، علاوہ اس کے رزمیہ دور میں جو خصوصیات دیوتاؤں کی بتائی جاتی تھیں، اُن میں انحطاط پیدا ہو چلا تھا اور انسانی عنصر کا شمول بڑھتا جاتا تھا۔ ویدوں میں جو صورت عبادت کی بتائی گئی تھی وہ بالکل ختم ہو گئی تھی۔

بعض بعض پرآن مثلاً بھگوت ایسے ہیں جن میں قدیم ہندویت سے انحراف تو نظر نہیں آتا، لیکن اصل وید کی تعلیم بھی انھیں نہیں کہہ سکتے، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی صورت ایسی قرار دے سکتے ہیں جسے قدیم ہندویت اور جدید ہندویت کا سنگم کہنا چاہیئے۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، ہندو مذہب نے اپنے ہر دور میں کثرت سے دیوتا پیدا کئے یہاں تک کہ اُن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی پرستش بھی برابر جاری رہی، لیکن یہ خیال کرنا کہ ہندو ان دیوتاؤں کو خدا سمجھتے تھے درست نہیں، ان کی بت تراشی گویا خدائے واحد کی حقیقی عبادت تھی جو آرٹ کی شکل میں کیجاتی تھی اور انکی صنم پرستی گویا اس امر کا اعتراف تھا کہ انسان خدا کا تصور اگر کر سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ قوارِ عالم و مظاہرِ فطرت کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ الغرض دنیا میں متعدد بت پرست قومیں پیدا ہوئیں۔ لیکن یہ شرف صرف ہندوؤں کو حاصل ہے کہ انکا شرک و کفر بالکل مجازی چیز ہے۔ اور حقیقت کے لحاظ سے ان کا مرتبہ وہی ہے جسے غالب کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ:-

ہمواره ترا شد بت و کافر نتواں گفت

ایک خاص اعلان

اگست ۱۹۳۵ء کے "نگار" میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی کا سالنامہ ۲۰ اگست کو شائع ہوگا مگر بعض اٹل مواقع کے باعث تاخیر ہو گئی اب یہ سالنامہ ۲۰ اکتوبر کو ضرور شایع ہو جائے گا اسی وجہ سے رعایت کی میعاد بھی بڑھا دی گئی ہے۔ یعنی ۱۹ اکتوبر تک سالانہ چندہ بجائے ۸½ کے صرف ۶½ لیا جائے گا اور طلباء اور لائبریریوں سے دو روپئے چھ آنے۔ نمونہ کا پرچہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر منگائیے۔

مینجر ہفتہ وار اخبار "گلفروش" دہلی

ایک راہبہ کے خطوطِ محبت

(بہ سلسلۂ جون ۳۷ء)

پانچواں خط ــــ

ابھی ابھی تمھارا عتاب نامہ وصول ہوا، کیا تم میری وفا کا امتحان لینا چاہتے ہو؟ تمھارے دل میں یہ خیال آیا ہی کیوں، کہ مجھے کسی دوسرے سے محبت ہو سکتی ہے؟ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ آپ مجھے ناصح مشفق بنکر یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ ایسی صورت میں قطع تعلق بہتر ہوگا! تم سے یہ فقرہ لکھا کیونکر گیا؟ تمھیں کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنی مجنونانہ بدگمانی سے رشک مجھے بھی ہوتا ہے لیکن اس دیوانگی میں بھی اتنا ہوش رہتا ہے کہ تمھارا دل نہ دُکھنے پائے اور تم ہو کہ قطع تعلق کی دھمکی دیتے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ تم محبت کے لطیف جذبے سے واقف ہی نہیں ہو۔ تم دکھانا تو چاہتے ہو کہ عشق کی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہو لیکن اپنی خام کاری کی وجہ سے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہو

میں اپنی بریت کے لئے ایک لفظ بھی نہ کہوں گی، میں چاہتی ہوں کہ تمھیں خود اپنی بدگمانی سے تکلیف پہونچنے لگے۔

یہ نہ سمجھنا کہ میں بات ٹال رہی ہوں۔ میں اپنی بے گناہی کے سیکڑوں ثبوت دے سکتی ہوں بلکہ سچ پوچھو تو تمھارے خیالی رقیب کو آج تک میں نے دیکھا بھی نہیں، لیکن میں تمھاری بدگمانی دور کیوں کروں؟ اگر میں تمھاری دھمکیوں کے بعد اپنی بے گناہی کا ثبوت دوں تو تمھارے دل میں معاً یہ خیال پیدا ہوگا کہ ڈر کر بات بنائی ہے پھر میں دیدہ و دانستہ اپنی محبت کی تذلیل کیوں کروں؟

آپ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی دوست بیچ میں پڑا تو میں اسے گولی سے اُڑا دوں گا لیکن آپ مطمئن رہیں کسی کو اپنی جان اتنی دوبھر نہیں ہے

ہاں تو آپ لزبن سے اس لئے رخصت ہو جائیں گے کہ مجھ روسیہ پر نظر نہ پڑ جائے مگر آخر اس کی کیا ضرورت ہے آپ کیوں جائیں، میں ہی خود کہیں کالا منہ کر جاؤں گی

تمھاری ان باتوں پر تو دل چاہتا ہے کہ آن توڑ کر تمھارے پاس آجاؤں اور اپنی بے گناہی ثابت کر کے تمھیں تمھاری رنجش بیجا پر منفعل کروں، سچ پوچھو تو دو تین دفعہ آنے کا ارادہ کیا بھی لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اگر دن دھاڑے تمھارے پاس

گئی تو کہیں افشائے راز کے رنج سے تمھارا غصہ نفرت کی صورت میں نہ تبدیل ہو جائے۔ میں تمھارے غصے کو برداشت کر سکتی ہوں لیکن تمھاری نفرت کی برداشت کی قوت نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمھارے آنے کی منتظر ہوں تاکہ میں تمھاری بدگمانی دور کر کے تمھاری شدید نفرت میں کچھ کمی پیدا کر سکوں۔

میں جانتی ہوں کہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کروں تو تمھارے غصے میں محبت کی جھلک دکھائی دے گی کیونکہ اگر تم کو مجھ سے سچی محبت نہ ہوتی تو رشک بھی نہ ہوتا لیکن دل کمبخت چپکے سے کہتا ہے کہ بدنصیب میرین تیرے ایسے نصیب کہاں!

اچھا تو جاؤ میں نے طے کر لیا کہ جرم نہ ثابت ہونے کے باوجود تمھیں گنہگارِ محبت سمجھوں گی اور اس طرح تم کو تمھاری بدگمانی کی قرار واقعی سزا دوں گی

میں جان بوجھ کر ایسی جگہ جانے سے اجتناب کروں گی جہاں تمھاری جھلک بھی دیکھ سکوں اور شاید یہ خط بھی آخری خط ہو

چھٹا خط ــــ

کیا سچ مچ تم ہی ہو جسے یہ خط لکھا جا رہا ہے اور کیا واقعی میں ہی بے حیا بنکر یہ خط لکھ رہی ہوں؟ یہ قصہ کیا ہے کہ تمھارے اعترافِ محبت کے باوجود مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی؟ تم بیتاب تھے تمھاری آنکھوں سے جوشِ اُلفت نمایاں تھا اور میرا دل بھی اسی طرح سرشار الفت تھا لیکن تم معافی مانگتے رہے اور میں نے صدق دل سے تمھیں معاف نہیں کیا خدا جانے کون اندر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ میرین، یہ ساری خوشامدیں تجھے منانے کے لئے کی جا رہی ہیں ان میں خلوص کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ میری جان، یہ نہ سمجھنا کہ میں ظاہری پیار اخلاص سے خوش ہو سکتی ہوں اگر مجھے شبہ بھی ہو جائے کہ یہ سب کچھ بناوٹی ہے تو میں تمھاری نفرت کو تمھاری مصنوعی الفت پر ترجیح دوں گی

وہ کل سہ پہر کو تمھارا بار بار معافی مانگنا، بات بات پر اپنی "سچی محبت" کا اظہار ہر لحظہ اپنی جفاؤں اور خطاؤں پر انفعال غرض تم سچ مچ ایک دوسرے آدمی معلوم ہوتے تھے اور سچ پوچھو تو تمھارے حد سے زیادہ جوش و خروش ہی سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ سب کچھ میرے غصے کو فرو کرنے کے لئے تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ روزانہ زندگی میں تصنع کو برتا جاتا ہے بلکہ شاید ہماری تہذیب کا دوسرا نام تصنع ہی ہے، لیکن محبت کی دنیا میں تصنع ناقابل تلافی جرم ہے، اس کا تعلق تو دل سے ہے، پھر عقل کے سوقیانہ کرتب کیوں دکھاؤ؟ عشق تو ایک جذبۂ بے اختیار ہے پھر اسے عقل کے اختیار میں کیوں دو؟

میں تمھارے پاس تمھیں خوش کرنے کے لئے بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ سرکار کی مرضی کی تابع بنکر نہیں آتی ہوں اور نہ اس لئے آتی ہوں کہ مجھے تمھارے پاس آنے کی عادت سی ہو گئی ہے میں آتی ہوں صرف اس لئے کہ میرا دل مجھے تمھارے پاس جانے کے لئے مجبور کرتا ہے کیا تم بھی کبھی محبت کے دشمن، فہم و خرد سے بے نیاز ہو کر دل کے احکام کی تعمیل کرتے ہو؟

میں آج شام کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے تمہارے پاس نہیں آسکوں گی۔ آؤ، آج ہم تم محبت کی اگلی پچھلی باتیں یاد کرکے ہجر میں وصل کی کیفیت پیدا کریں۔

ساتواں خط ——

جب قسم کی پابندی سے کسی کے دل دکھنے کا اندیشہ ہو تو قسم توڑ ڈالنے میں زیادہ ثواب کی امید ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہیں ایک نہ ایک دن مجبوراً جدا ہونا ہے پھر ہم جان بوجھ کر اپنے ہاتھوں ہجر کی سختیاں کیوں جھیلیں؟ آؤ اور اس دلِ خانہ خراب کو یقین دلاؤ کہ تم بھی ہجر کی تکلیفوں سے کچھ کم بےچین نہیں تھے۔

تمہارا یہ خیال بے بنیاد ہے کہ میں تمہارے گزشتہ تغافل کو معاف نہیں کروں گی میری جان، آکے تو دیکھو، میں اُلٹی معافی مانگنے کے لئے طیار ہوں

آج صبح گرجا میں میں نے تمہاری نیچی نگاہوں میں پشیمانی کی دلفریب جھلک دیکھی تھی اور مجھے یقین ہے کہ میرے چپ رہنے کے باوجود تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں تم سے باتیں کرنے کے لئے بیتاب تھی اور میرے منہ پھیرنے سے تم سمجھ گئے ہوگے کہ میں تمہیں دل بھر کر دیکھنے کے لئے بیقرار تھی۔ پھر جب ہم دونوں پچھلی باتیں بھولنے کے لئے تیار ہیں تو یہ شرم کیسی، آؤ، میں وعدہ کرتی ہوں کہ اول تو گئی گزری باتوں کا ذکر ہی نہ کروں گی اور کبھی بھولے سے ذکر آ بھی گیا تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ ہم آیندہ ان رنجشوں سے الگ رہیں۔

ہم محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں پھر ہمیں ان لڑائی جھگڑوں سے کیا کام؟ تمہیں بتاؤں کہ اگر فطرت مجھے تمہارا پرستار نہیں بنانا چاہتی تھی تو اس نے مجھے اتنا درد آشنا دل کیوں دیا، تمہیں غور کرو کہ اگر قدرت تم کو بندۂ عشق نہیں بنانا چاہتی تھی تو اس نے تمہارے دل کو سوز و گداز کی نعمت کیوں عطا کی؟ اچھا یہ بتاؤ کہ اس مصنوعی (مصنوعی اس لئے کہتی ہوں کہ دو درد آشنا دل کبھی سچ مچ ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہو سکتے) شکر رنجی میں تمہاری کیا کیفیت تھی؟ میری حالت تو کچھ عجیب تھی۔ میرا دل جو تمہیں دیکھ کر خوش ہونے کا عادی ہو گیا تھا حسب معمول آنکھوں کے ذریعے سے اپنی مسرت کو ظاہر کرنا چاہتا تھا لیکن جب میرے ارادے سے مغلوب ہو کر آنکھیں دل کا پیغام پہونچانے سے انکار کرتی تھیں تو دل ایسی چٹکی لیتا تھا کہ میں تڑپ کر رہ جاتی تھی اور اگر میرا خیال غلط نہیں ہے تو انتہائی ضبط کے باوجود تمہاری شرمگیں نگاہوں سے محبت کی جھلک ظاہر ہو ہی جاتی تھی۔

میں جانتی ہوں کہ اس شکر رنجی کے دوران میں اکثر جگہ ہم تم کوشش کرکے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہیں لیکن بعض دفعہ تو ایسی جگہ ملاقات ہوئی ہے کہ مجبوراً قسمت کا قایل ہونا پڑا پھر جب فطرت کا بھی یہ منشا ہے کہ ہم جدا نہ ہوں اور ہمارے دل بھی ایک ہو جانے کے لئے تڑپ رہے ہوں تو ہم ہجر کے صدمے کیوں سہیں؟

اگر اس وقت تمھارے پاس جانا ممکن ہوتا تو میں اتنا طولانی خط نہ لکھتی لیکن چونکہ اسوقت تمھارے پاس آنے میں افشائے راز کا اندیشہ ہے اس لئے خط کے ذریعہ سے دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں

پو پھٹنے کے قریب ہے اور گھر والے خواب شیریں کے مزے لے رہے ہیں لیکن انھیں کیا معلوم کہ کہیں دل لگا ہو تو سونے سے کہیں زیادہ جاگنے میں لطف آتا ہے

میری جان خوش ہو کہ سورج نے طلوع ہو کر ہجر کی لمبی اور بھیانک رات کو ختم کر دیا۔ اگر سورج کے سینے میں دل ہوتا اور وہ ہجر کے مصائب سے واقف ہوتا تو شاید آج کچھ پہلے طلوع ہوتا مگر اس آتشیں رخ، آتشیں مزاج کو محبت کی لطافت سے کیا واسطہ؟

اچھا تو میں اس بے حس سورج کی سست رفتاری کو معاف کرتی ہوں اور یہ خط روانہ کرنے کے بعد کچھ دیر سونے کی کوشش کروں گی۔

طالب صفوی

تمام وہ اصحاب

جنھوں نے مجموعۂ استفسار کی پہلی دو جلدیں خریدی ہیں

براہِ کرم نوٹ فرمالیں کہ تیسری و آخری جلد شایع ہونے کے بعد دو روپیہ رعایت قیمتی پر (علاوہ محصول) ان کے نام غالباً اخیر ستمبر میں ذریعۂ وی۔ پی روانہ کر دیجائے گی اگر اس دوران میں ان کی ممانعت کا خط نہ آگیا۔

یہ جسارت نہ صرف خریداران نگار کے علمی و ادبی ذوق کے بنا پر کی جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ پہلی دو جلدیں بغیر تیسری جلد کے زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں اور ہر شخص پورا سٹ ہی رکھنا پسند کرے گا۔

مینیجر "نگار"

امیر خسرو ماہر موسیقی کی حیثیت سے

میں حضرت امیر خسرو کے سوانح حیات بیان نہیں کروں گا۔ کہ یہ آپ کو تذکروں اور کتب تاریخ میں بکثرت مل سکتے ہیں نہ میں اُن کی شاعری اور دیگر کمالات کے متعلق کچھ کہوں گا۔ کہ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ میں فقط ان کو ایسی حیثیت سے پیش کرونگا جس کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، بلکہ اُس کا ذکر ہمیشہ محض ضمنی طور سے کیا جاتا رہا یعنی "امیر خسرو ماہر موسیقی کی حیثیت سے"

شاعر کے مجموعۂ کلام سے آپ اُس کے بلند تخیل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مصور کے نقوش اُس کے کمالِ فن کا آئینہ ہیں سنگتراش اپنی روح کو پتھر کے اندر زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ لیکن مغنّی! مغنّی کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے، کہ اُس کے آثارِ باقیہ اُس کے کمال کے اظہار سے قاصر ہیں، کیا آج آپ اس دور کے کسی گویئے کی زبان سے تان سین کے باندھے ہوئے میگھ راگ کو سنکر اُس کی اصل صورت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جس کے متعلق (گو وہ مبالغہ ہی کیوں نہ ہو) کہا جاتا تھا کہ اس کے اثر سے کالی گھٹائیں اُمنڈ آیا کرتی تھیں اور مینہ برسنے لگتا تھا۔

ہندوستان کی خاک سے یوں تو بڑے بڑے ماہرینِ موسیقی پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستانی سنگیت میں عجب عجب جدت طرازیاں اور رنگ آمیزیاں کر کے اس فن کو اوجِ کمال پر پہونچا دیا۔ لیکن آج ہمارے پاس اُن کی سُہانی یاد اور اُن کے کمالات کے لطائف کے سوا اور کیا ہے۔ البتہ امیر خسرو ایک ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کے کمال موسیقی کا کسی قدر اندازہ ہم اُن کی ایجادات سے کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں سے پہلے ہند میں موسیقی کی کیا صورت تھی۔ مسلمانوں نے اس میں کیا کیا اضافے کئے اور قدیم ہندی، عربی و ایرانی موسیقی کے اختلاط سے ہندوستانی سنگیت کو کیا فایدہ پہونچا، اس کے بیان کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے لیکن اس سے بالکل قطع نظر بھی مناسب نہیں، چنانچہ میں یہاں مختصر طور پر اس کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں۔

ہندوؤں کی پرانی روایات کے مطابق ہندوستانی سنگیت کو برہما نے ایجاد اور مہادیو نے اس کی اشاعت کی اور پھر مختلف رشیوں نے جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے اسے ترقی دی۔ بالخصوص نارد منی نے جو ہندو عقیدے کے مطابق سارے جہان کا سفر کرتے تھے، آسمان کے رہنے والوں کو یہ فن سکھایا اور پھر رفتہ رفتہ راگ بدیا ساری دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا والوں نے جوشِ عقیدت سے دیوتاؤں کے اس مقدس عطیہ کو انھیں کی ثنا خوانی کا ذریعہ بنایا اور یہ سلسلہ اَن گنت صدیوں تک جاری رہا۔

آخر مسلمان ہندوستان میں آئے۔ اُن کے آنے سے اس فن کی ہیئت بدل گئی۔ اس میں تقدس کا رنگ ماند پڑ گیا، اس کے بجائے یہ کمال فن کے اظہار اور اس سے لطف اندوزی کا ذریعہ بن گیا۔ اور انسان اپنے دُکھ درد، اپنی آرزوئیں، اپنے احساسات اور تمام وہ لطیف جذبات جنھیں وہ کھُلم کھُلا عام گفتگو میں بیان نہ کر سکتے تھے، راگ کے ذریعہ سے ایک دوسرے پر ظاہر کرنے لگے، اور آج تک کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسوقت ہندوستان میں جو نظام موسیقی قایم ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں ہی کا رائج کردہ ہے۔ رتناکر، سنگیت درپن اور سنگیت سار سے جو ہندوستانی موسیقی کی نہایت مستند پرانی کتابیں، اسے کوئی نسبت نہیں۔

مسلمانوں کی اس کارگزاری میں سب سے بڑا حصہ حضرت امیر خسرو کا ہے۔ جنھوں نے آج سے ساڑھے چھ سو برس قبل مسلمانوں میں سب سے پہلے ہندوستانی سنگیت کی طرف توجہ کی۔ اور اپنی حیرت انگیز قوت فکر سے کام لیکر عجمی موسیقی اور عجمی زبان کی آمیزش سے ایک نئی قسم کی موسیقی کی طرح ڈالی۔ اور اس میں ایسے ایسے گل بوٹے اور نقش و نگار بنائے کہ یہ فن جسے مذہبی تقدس کے غلبہ نے پھیکا کر دیا تھا، حد درجہ شیریں اور پُرکیف بن گیا۔

حضرت امیر خسرو سے پہلے یہاں گانے کے جو طریقے مروج تھے اُن میں سے اہم یہ تھے، گیت، سن، چھند، دھرو دھرواما ٹھا۔ اور پربند، یہ چیزیں سنسکرت اور پراکرت ملی جلی زبان میں گائی جاتی تھیں۔ ان میں عموماً دیوتاؤں کی ستایش ہوا کرتی تھی۔ حضرت امیر خسرو نے ان کے بجائے یہ نو قسم کے گانے کے طریقے ایجاد کئے۔ قول، قلبانہ۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش۔ گل۔ بسیط۔ تلانہ اور سوہلہ۔ ترانہ ان الفاظ سے مرکب ہے "تانوم۔ نوم تا۔ تادیرے۔ دیرے نا دردے۔ یہ الفاظ صرف ان آٹھ حروف سے مل کر بنتے ہیں۔ تے۔ دال۔ نون۔ الف۔ یے۔ میم۔ رے اور واؤ۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو نے جو ترانے ایجاد کئے وہ سب بامعنی تھے۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک ترانہ کے بول یہ ہیں:۔

درا آدر آدر تنم در آجان من در آ در آ

بہ تنگ آمدہ ام چند انتظار کشم بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم

قلبانہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں زبان عربی و ہندی دونوں شامل ہیں۔ اس کی استھائی عموماً تال سواری میں اور انترہ تتالہ میں گایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک قلبانہ کے بول سناتا ہوں

استھائی۔ لقد صدق قولہ تعالےٰ۔ بھیجو درود اور سلام

انترہ۔ امیر خسرو بل بل جاویں۔ حضرت نظام الدین کے دربار۔ گاویں قلبانہ

قول اس طرح ہے۔ کہ کچھ الفاظ عربی اور فارسی کے اور کچھ ترانے کے ملا دئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قول کی استھائی سنیئے:۔

حی یا در دتالالے حسن و نظام الدین اولیا۔ دیم دیم در دو در تلے تان تلے تنانا نانا نانا۔ اس کا انترہ یہ ہے:۔

فانما تولوا فثم وجہ اللہ۔ دِرتم دِرتم تومتانانا در درتلے تلے درا درا جانم۔ دیم دیم در در در تلے تان تلے تنانا نانا۔ اس کی استھائی اور انترے کی تالیں الگ الگ ہیں۔

نقش میں ایک ربا عی ہوتی تھی۔ اور گل میں فقط ایک شعر جو بجائے خود ایک سر تیز نشتر ہوتا تھا۔ ان دونوں میں تال نہیں بدلتی تھی۔ بسیط چھند کے بجائے تلانہ ایک قسم کا ترانہ ہے۔ کہ اس میں ترانے کے الفاظ کے بجائے تمام تلی اور تانا ہوتا ہے۔ الفاظ فارسی نظم و نثر سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔ سوہلہ میں فقط شادی بیاہ کا ذکر ہوتا تھا اور بس۔

خیال میں عموماً عاشقانہ مضامین ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں عامیانہ رنگ بالکل نہیں ہوتا۔ دلکش تانیں، تحریر اور تذبذب وغیرہ خیال کی جان ہیں۔ جس سے یہ حد درجہ دل پذیر بن جاتا ہے۔ گانے کا یہ طریقہ جسے سلاطین شرقیہ کے آخری بادشاہ سلطان حسین شرقی جونپوری نے پندرھویں صدی عیسوی میں دوبارہ زندہ کیا اور محمد شاہ بادشاہ دہلی کے درباری گویئے نعمت علی خاں سدارنگ نے اوج کمال پر پہونچا دیا اس درجہ مقبول ہوا کہ آج خیال نے کلاسیکل میوزک کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

افسوس ہے کہ حضرت امیر خسرو کی ان ایجادات میں سے خیال اور ترانہ کے سوا باقی تمام چیزیں مٹ گئیں۔ اور خال خال اشخاص کے سوا کوئی ان کے نام تک سے واقف نہیں۔

امیر خسرو کی ان ایجادات کے متعلق ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے۔ جو مختلف کتب تاریخ اور تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ اور جسے مولانا شبلی نعمانی نے بھی شعر العجم میں رقم فرمایا ہے وہ یہ کہ امیر خسرو کے زمانہ کا مشہور جگت اُستاد نایک گوپال تھا۔ اُسکے بارہ سو شاگرد تھے جو اُس کے سنگھاسن کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا۔ تو دربار میں بلوایا۔ امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر خسرو بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمایش کی۔ امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یونہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا، گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ دُھن تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اس کو ادا کیا۔ گوپال نے دوسری چیز شروع کی۔ امیر نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں۔ غرض گوپال جو چیز شروع کرتا۔ امیر اپنی ایجاد بتاتے۔ بالآخر کہا۔ اب میں اپنی خاص ایجادات آپ کو سناتا ہوں۔ پھر جو گائے۔ تو نایک گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا کیونکہ قول، قلبانہ، خیال، ترانہ اُس کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا۔

حضرت امیر خسرو نے موسیقی میں نایک کا سب سے اونچا درجہ حاصل کیا۔ اُن کے بعد آج کہ ساڑھے چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا ہے، یہ خطاب پھر کسی کو نصیب نہ ہو سکا، آپ میں نایک کی ساری صفتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ یعنی آپ زمانۂ ماضی و حال کی موسیقی کے عالم باعمل تھے، سنگیت کے واقف کار تھے اور راگوں کے بنانے کا قاعدہ جانتے تھے

آپ نہ صرف خود بہت اچھا گاتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے چنانچہ اُن کے ہاں شرفا اور بچوں کے جو لڑکے قرأت اور عربی کے درس کے لئے آتے تھے آپ علمی تعلیم کے علاوہ اُنھیں موسیقی کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ چنانچہ اسی وقت سے قوالی کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کی بارہ چھبیں رائج ہوئیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ امیر خسرو نے قول۔ قلبانہ۔ نقش و گل۔ ترانہ۔ خیال۔ بسیط۔ تلانہ اور سوبلہ، گانے کے یہ نو طریقے اختراع کئے۔ علاوہ ازیں آپ نے عجمی مقاموں یعنی راگوں کی آمیزش سے بے شمار ہندی راگ بھی ایجاد کئے۔ اُن کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ لیکن میں بنظر اختصار صرف چند راگوں کا ذکر کرتا ہوں۔

ایمن۔ ہنڈول اور ایک فارسی مقام یعنی راگ نیریز سے مرکب ہے۔ یہ راگ ہندوستانی موسیقی کے نہایت اہم راگوں میں شمار ہوتا ہے اور حقیقتاً حد درجہ دلکش و مست کُن ہے۔

سازگری۔ پوربی۔ گورا۔ گن کلی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

مجیر۔ غارا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

موافق۔ برادی اور مالسری میں فارسی راگ کی آمیزش کی۔

عشاق۔ سارنگ و بسنت اور ایک فارسی مقام سے مرکب ہے۔

غنم۔ پوربی میں ذرا سا تغیر کر دیا ہے۔

زلیف۔ کھٹ راگ میں فارسی راگ شہ ناز کو ملایا ہے۔

غزال۔ پوربی۔ بھاس۔ گورا اور گن کلی سے مرکب ہے۔

صنم۔ کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

فرغانہ۔ یہ سولہ ہندی راگوں اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

سرپردہ۔ گوڑ سارنگ اور بلاول میں فارسی مقام راست کی آمیزش کی ہے۔

بافر۔ دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے۔

فردوست۔ کانڑا۔ گوری۔ پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

راگ درپن مصنفہ فقیر اللہ میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری۔ بافر۔ عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے یہ راگ جن کا میں نے نام لیا ہے۔ حضرت امیر کی خاص ایجاد ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے بے شمار پرانے راگوں میں تغیر و تبدل کر کے اُن کی نئی قسمیں بنائیں۔ مثلاً گونڈ ملار کے میل سے ایک خاص قسم کا کانڑا ایجاد کیا۔ جس کا نام باگیسری قوالی رکھا یہ حد درجہ دلکش اور شیریں ہے۔ دوسرا کانڑا شاہانہ، سارنگ کے میل سے جس میں مدھم زیادہ لگتی ہے۔ اور نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اَدُر راگوں میں تھوڑا تھوڑا تصرف کر کے سوہنی قوالی۔ یوریا للت۔ زام کلی قوالی۔ ٹوری برادی۔

ٹوڑی اساوری - پوربی - پردیپکی - بہار قوالی اور بسنت قوالی وغیرہ وغیرہ کئی جداگانہ قسمیں بنائیں -

میں نے جتنے راگوں کے نام گنوائے ہیں ظاہر ہے کہ حضرت امیر خسرو نے ان کے کئی کئی گیت بھی لکھے ہوں گے اسی طرح قول - قلبانہ - خیال ترانہ وغیرہ جو نو گانے کے طریقے اُنھوں نے ایجاد کئے - ان کی بھی کئی کئی چیزیں باندھی ہوں گی - اس حساب سے کچھ نہیں تو ہزار بارہ سو گیت وغیرہ لکھے ہوں گے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان میں لحن بندی یعنی نوٹیشن کا رواج نہ ہونے کے باعث یہ سارا ذخیرہ ضایع ہوگیا -

حضرت امیر خسرو نے اور تال میں بھی بے حد مہارت رکھتے تھے - چنانچہ آپ نے ارکان و اوزان فارسی کے بموجب حسب ذیل سترہ تالیں مقرر کیں -

اول پشتو ایک تال کی - دوم ذوبحر تین تال کی - سوم قوالی تین تال کی - چہارم اُصول فاختہ تین تال کی - پنجم جت تین تال کی - ششم زلہ تالہ تین تال کا - ہفتم سواری چار تال کی - ہشتم آڑا چوتالہ چار تال کا - نہم جھومرا تین تال کا - دہم جھپ تالہ تین تال کا - یازدہم خمسہ پانچ تال کی - دوازدہم فردوست پانچ تال کی - سیزدہم پہلوان چار تال کی - چہاردہم قید - پانزدہم داستان شانزدہم پٹ تال - ہفت دہم چیک - ان میں سے سوائے دو چار کے باقی ساری کی ساری نہ صرف اب تک رائج ہیں بلکہ ہندوستانی لے کاری کی جان سمجھی جاتی ہیں - ان میں سے تال پشتو خاص طور پر نقش و گل اور رباعی وغیرہ گانے کے لئے ایجاد کی اور داستان نقارہ بجانے کے لئے -

حضرت امیر کی جدت پسند طبیعت نے ساز بھی اختراع کئے جو آج تک مقبول زمانہ ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ستار ہے - اس ساز کی ایجاد ایسا کارنامہ ہے - کہ اگر امیر خسرو موسیقی میں اَور کچھ نہ کرتے تو تنہا یہ ایجاد اُن کے نام کو رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی - ستار کو ہر زمانے میں بے حد مقبولیت ہوئی، بہت سے نامی گرامی ستار بجانے والے ہر زمانے میں ہوئے - ستار خوش آوازی میں بین کا مقابلہ کرتا ہے اور پھر بین کی نسبت آسان بھی ہے - حضرت امیر نے اس کے بجانے کے کئی نئے قاعدے - الاپ، ٹھاہ، دون اور مضرابیں مقرر کیں - دوسرا ساز ڈھولک ہے - ڈھولک کو گو اعلیٰ پایہ کے گویّوں میں مقبولیت نہ ہوئی - مگر عام لوگوں خصوصاً عورتوں میں ایسی مقبولیت ہوئی کہ ہندوستان میں آج تک بیاہ شادی کی رونق ڈھولک کے دم سے قایم ہے -

امیر خسرو نہ صرف ہندی موسیقی کے عالم باعمل تھے - بلکہ وہ عجمی موسیقی کے بھی بہت بڑے ماہر تھے - اُنھوں نے عجمی و ہندی موسیقی کے متعلق متعدد کتابیں بھی لکھیں لیکن افسوس ہے کہ یہ مفید ذخیرہ گیتوں کی طرح ناپید ہو چکا ہے

حضرت امیر خسرو شاعری میں زیادہ کمال رکھتے تھے یا موسیقی میں - میں کہوں گا چاہے اس سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو، کہ موسیقی میں ان کا پایۂ شاعری کی نسبت کہیں بڑھا ہوا تھا - گو اُنھوں نے چار لاکھ سے اوپر اشعار کہے - تنانوے کتابیں لکھیں اور فارسی نظم میں جملہ اصناف سخن پر خامہ فرسائی کر کے اپنی ہمہ گیر طبیعت کا ایسا ثبوت دیا جس کی نظیر اُن کے

پیش رو شاعروں میں نہیں ملتی۔ لیکن اس کے باوجود مثنوی میں ان کا پایہ فردوسی اور نظامی سے کم ہی رہتا ہے۔ غزل میں وہ حافظ و سعدی و نظیری کو نہیں پہونچ سکتے۔ اور قصیدے میں اگر وہ کمال اور ظہیر سے پیچھے نہیں تو آگے بھی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس وہ سنگیت میں ایسے جگت اُستاد تھے۔ کہ اس ساڑھے چھ سو برس کی طویل مدت میں اُن کا جواب پیدا نہیں ہوا۔ نایک گوپال جیسا اُستاد اُن کے کمال کا ثناخواں ہوا اور بڑے بڑے گویّے آج بھی ان کا نام سُن کر کان پکڑتے ہیں۔ بیسیوں نئے راگ ایجاد کئے۔ گانے کے نو مختلف طریقے نکالے۔ ستار ایجاد کیا جو سریلے پن میں بین کو شرماتا ہے۔ خیال اور ترانہ کو آج معیاری موسیقی کا درجہ حاصل ہے اور پشاور سے لیکر راس کماری تک انھیں کا سکہ چل رہا ہے۔ سترہ تالیں ایجاد کیں، جن میں سے سوائے دو چار کے باقی سب کی سب نہ صرف رائج ہیں۔ بلکہ ہندوستانی سنگیت میں سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔

آخر میں میں حضرت امیر خسرو کا ایک قول نقل کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت امیر موسیقی کا کیا درجہ سمجھتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں:۔ "موسیقی علم سفینہ نہیں، علم سینہ ہے۔ اگر علم سفینہ ہوتا تو فارسی کی طرح اس کے بھی کئی دفتر تیار کر دیتا، حسرت یہ ہے کہ دل کی دل ہی میں رہی۔ سارا مدار حیات و ممات اسی علم پر ہے۔"

غلام عباس

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعرا کے چوٹی کے کلام کا خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قایم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ اور متحد المضامین اشعار درج ہیں، عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مصرعہ:۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت مع محصول ڈاک ۸؎ ضخامت ۲۳۶ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب۔ دار المصنفین۔ اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

اسفارِ موسیٰ علومِ جدیدہ کی روشنی میں

(مسلسل)

بنی اسرائیل کی ہجرت

جب متعدد وبیہم عذاب نازل ہونے کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دی تو یہ سب کے سب معہ اپنے گلوں اور اسباب کے خانہ بدوشوں کی طرح ایک رات مصر سے باہر نکلے۔ کہا جاتا ہے کہ روانگی کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا اور تمام افراد بیک وقت سب کے سب ایک ساتھ روانہ ہو گئے اور صحرا سینا میں جا کر پناہ لی۔

اس بیان کو صحیح باور کرنے کے لئے عقل انسانی کو کتنی جگہ تامل کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ زیادہ دشوار نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ فرعون کی پروانگی حاصل کرنے کے بعد فوراً ۳۰ لاکھ افراد کا ایک ہی وقت میں روانہ ہو جانا کیونکر قابل عمل تھا۔ اُسوقت نہ کہیں تار تھا نہ ٹیلی فون، نہ ڈاک خانہ کا یہ نظام تھا اور نہ نشر گاہ لاسلکی کی موجودہ قوت و وسعت پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے ۳۰ لاکھ افراد کو اسقدر جلد وقتِ روانگی کی اطلاع دیدی اور وہ سب دفعتاً طیار ہو کر ایک ساتھ روانہ بھی ہو گئے۔

اس زبردست جماعت میں ۶ لاکھ تو صرف وہ نوجوان تھے جو نبرد آزمائی کر سکتے تھے، بچے، عورتیں اور بوڑھے انکے علاوہ تھے۔ اب غور کیجئے کہ یہ جا کہاں رہے تھے؟ صحرا سینا میں۔ یعنی اس صحرا میں جس کی خشکی و ویرانی کے سامنے صحرا اعظم گویا باغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ ۴۰ سال تک رہے۔ لیکن عقل حیران ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے لئے ایسے خشک و بے آب و گیاہ صحرا میں سامان خورد و نوش کہاں سے میسر آیا۔ ان کے ساتھ بھیڑیں اتنی کثرت سے موجود تھیں کہ ایک بار بنی اسرائیل نے ایک لاکھ پچاس ہزار پہلوٹی کے بچوں کی قربانی کی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بھیڑوں کے اتنے بیشمار گلوں کے لئے جن کو لاکھوں ایکڑ چراگاہ کی ضرورت تھی اس ریگستان میں کیونکر زندہ رکھا گیا۔

خدا، بنی اسرائیل کو ارض فلسطین کی طرف سے نہیں لے گیا اس خوف سے کہ مبادا یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر وہ پھر مصر واپس چلے جائیں بلکہ صحرا کے راستہ سے بحر احمر تک لے گیا اور اس سفر کی شان یہ تھی کہ دن کو بادلوں کا ایک ستون ان کی رہنمائی کرتا تھا اور رات کو آگ کا ستون۔

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل بھاگ گئے تو اس نے ۶۰۰ رتھوں پر اپنے سپاہیوں کو بٹھا کر ان کا تعاقب کیا اور ساحل تک پہونچتے پہونچتے ان کو جالیا۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حضرت موسیٰ کی بد دعا سے دبا میں مبتلا ہو کر قصر کے تمام جانور فنا ہو چکے تھے اور طاعون نے وہاں کی بہترین آبادی کو ختم کر دیا تھا تو ۶۰۰ رتھوں کے لئے گھوڑے اور سپاہی کہاں سے آگئے۔

اسی کے ساتھ اسفارِ موسیٰ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصریوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے (درانحالیکہ ان میں ۶ لاکھ جنگجو نوجوان موجود تھے) اور یہ خوف اس درجہ غالب ہوا کہ آخر کار حضرت موسیٰ کو پھر معجزہ سے کام لینا پڑا۔ یعنی اپنے عصا کے اشارہ سے پانی کے دو حصے کر دئے جس سے درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس سے عبور کر گئے، لیکن جب مصری فوج عبور کرنے لگی تو خدا نے رتھوں کے پہیے الگ کر دئے اور جس وقت وہ بیچ دریا میں پہونچے تو پھٹا ہوا پانی پھر لگیا اور سب کے سب غرق ہو گئے۔

اول تو یہ بات نہایت عجیب و غریب ہے کہ آزاد ہونے کے بعد بھی بنی اسرائیل کی بزدلی و کم ہمتی بدستور باقی رہی اور باوجود ۶ لاکھ نبرد آزما سپاہ رکھنے کے ان کو مصریوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی (حالانکہ ۶۰۰ رتھوں میں زیادہ سے زیادہ ۵۰ یا ۶۰ ہزار سے زیادہ آدمی نہ رہے ہوں گے) اور حضرت موسیٰ کو اپنے معجزہ کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ علاوہ اسکے یہ بات بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عصا کے اشارہ سے پانی پھٹکر دو دیواروں کی طرح علٰحدہ علٰحدہ کیونکر قایم ہو گیا اور خدا نے رتھوں کے پہیے علٰحدہ کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی، آیا خود اس نے یہ زحمت گوارا کی یا فرشتوں کو اس خدمت کیلئے مامور کیا

اب دیکھئے کہ یہ لوگ جا کہاں رہے تھے۔ یہ اُس ارضِ موعودہ کی طرف جا رہے تھے جس کا رقبہ بارہ ہزار میل سے زیادہ نہ تھا اور جو سوائے خشک چٹانوں اور بے آب و گیاہ ویرانیوں کے کچھ نہ تھا۔ یہاں پہلے سے کتنے لوگ آباد تھے، اسکے متعلق حضرت موسیٰ کا بیان ہے کہ یہاں سات قومیں، یہودیوں سے زیادہ قوی آباد تھیں، اس کے معنے یہ ہیں کہ یہودیوں کی ۳۰ لاکھ آبادی کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم از کم ۲ کروڑ رہی ہو گی جن کو خدا نکال کر یہودیوں کو بسانا چاہتا تھا۔ لیکن خدا کا مقصود یہ نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فوراً ارضِ کنعاں تک پہونچا دے، اس لئے انھیں ۴۰ سال تک برابر صحرا میں سرگرداں رکھا یہاں تک کہ سوائے دو کے باقی سب فنا ہو گئے۔

جب بنی اسرائیل نے بحر احمر کو عبور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں غذا کا کوئی سامان فراہم نہیں ہو سکتا اور پانی اسقدر شور ہے کہ اس کا پینا محال ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ نے خدا سے دعا کی تو ایک درخت نمودار ہوا جس کو کاٹ کر حضرت موسیٰ نے پانی میں ڈال دیا اور پانی شیریں ہو گیا۔ غذا کے لئے خدا نے یہ تدبیر کی کہ رات کو چھوٹے چھوٹے اولوں کے برابر ایک گول سی چیز آسمان سے برسائی جو سورج کی گرمی سے تو پگھل جاتی تھی لیکن آگ میں اس کو بھون سکتے تھے اس کا نام مَن تھا۔ اس پر ۴۰ سال تک انھوں نے بسر کی، یہاں تک کہ وہ اس سے بیزار ہو گئے اور گوشت وغیرہ طلب کرنے لگے جس پر خدا

بہت برہم ہوا اور انھیں لوگوں کو جن سے دودھ اور شہد رکھنے والی سرزمین کا وعدہ کیا گیا تھا، سانپوں سے ڈسوایا گیا۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے گوشت اور لہسن پیاز وغیرہ کی خواہش کی تو خدا نے نہایت زبردست آندھی چلائی جس سے ایک پرندہ جس کا نام لوا (سلویٰ) ہے خیموں پر آآکر گرنے لگا اور ایک مہینہ تک اسقدر گوشت ان کا کھلوایا کہ آخرکار وہ اُن کے ناک منھ سے باہر آنے لگا اور پھر سانپ سے ڈسوانے کے بعد طاعون کی بلا ان پر نازل کی۔

اس بیان میں بعض باتیں نہایت عجیب و غریب ہیں اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ صحرا میں درخت کا نمودار ہونا، اس کی مدد سے شور پانی کا شیریں ہوجانا، من و سلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، یہ سب کچھ معجزہ تھا، تو بھی یہ امر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خدا اپنی اس برگزیدہ قوم سے (جس کی نجات کے لئے تمام مصر کو تباہ کرنا گوارا کیا گیا) صرف اس بنا پر کہ وہ ایک ہی قسم کی غذا چالیس سال تک کھاتے کھاتے اکتا گئی تھی کیوں برہم ہوگیا اور اس میں انکا کیا قصور تھا۔ یہ بالکل فطرت انسانی ہے کہ مسلسل ہفتہ عشرہ تک ایک ہی غذا کھانے کے بعد اس سے تنفر پیدا ہوجاتا ہے چہ جائیکہ مسلسل ۴۰ سال۔ اسلئے ان کے اس مطالبہ پر اظہار برہمی اور وہ بھی اس حد تک کہ انھیں سانپوں سے ڈسوایا گیا، طاعون میں مبتلا کیا گیا، کیونکر جایز و مناسب قرار دیا جاسکتا ہے۔

کیا وہ خدا جو اپنے برگزیدہ بندوں کے لئے من و سلویٰ نازل کرسکتا تھا، اس کی قدرت سے یہ امر باہر تھا کہ وہ غذا میں تنوع پیدا کرتا رہتا اور اس فطرتِ انسانی کی رعایت کرتا جو خود اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔

اسفارِ موسیٰ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے دوران قیام میں بنی اسرائیل کا لباس بھی بوسیدہ نہیں ہوا اور جو جوتے وہ پہنے ہوئے تھے وہ بھی نہیں پھٹے بعض مفسرین کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے لباس وغیرہ کی نگہداشت خدا نے بعض مخصوص فرشتوں کے سپرد کردی تھی جو ان کا لباس آکر درست کردیا کرتے تھے اور پھٹے ہوئے جوتے ٹانک دیا کرتے تھے۔ لیکن یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ اگر ۴۰ سال تک لباس وغیرہ وہی رہا تو کیا بچوں کی عمروں کے ساتھ ان کا لباس بھی بڑھتا رہا اور پاؤں کی درازی کے ساتھ ساتھ جوتوں کا سایز بھی بڑا ہوتا گیا۔

خدا نے بنی اسرائیل کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ وہ صحرا میں درخت نصب کریں، درانحالیکہ وہاں اس سے قبل گھاس تک کا بھی وجود نہ تھا تو کیا بنی اسرائیل مصر سے اپنے ساتھ درختوں کے تخم بھی لائے تھے جو انھوں نے وہاں بوئے اور اگر بوئے تھے تو ان کے نشوونما کی کیا صورت تھی جبکہ پانی کا وہاں وجود نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بغیر پانی کے تخم یا درخت کو بارآور کردے، تو کیا اس کی قدرت سے دور تھا کہ صحرا کو دفعتاً چمنستاں میں تبدیل کردیتا، لیکن اسنے ایسا نہیں کیا اور ایک محال بات کے انجام دینے پر بنی اسرائیل کو مجبور کیا۔

حضرت موسیٰ کو ایک خاص قسم کا خوشبودار تیل بنانے کا بھی نسخہ خدا نے بتایا جو حنا و زیتون وغیرہ مختلف درختوں کے پھلوں پھولوں سے طیار ہوتا تھا۔ اس تیل سے متبرکہ دیا جاتا تھا اور اس نسخہ کو نہایت راز رکھا گیا تھا یہاں تک کہ اگر سوائے

موسیٰ اور ہارون کے کوئی اور یہ تیل بنانے کی جرأت کرتا تو اس کے لئے خدا کا حکم یہ تھا کہ مار ڈالا جائے۔

اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس صحرا کی ویرانی و خشکی کا یہ عالم ہو کہ لوگوں کا سامان خورد و نوش فراہم نہ ہو سکے وہاں عطریات پیدا کرنے والے درخت کہاں سے آ گئے اور اگر حضرت موسیٰ نے کوئی تیل ایسا طیار کیا تھا تو دوسروں کو کیوں ممانعت کی گئی اور اس میں ایسی کیا خصوصیت تھی کہ سوائے حضرت موسیٰ کے کسی اور کو اس کی طیاری کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسی صحرا کے دورانِ قیام میں یہودیوں کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ بطور کفارۂ گناہ ہر جننے والی "ماں" فاختہ کا ایک جوڑا "موبدوں" کے پاس لائے جس کا کھانا اُن پر فرض تھا۔ جس وقت خدا کا یہ حکم نازل ہوا ہے اسوقت یہودیوں کی آبادی ۳۰ لاکھ تھی اور "موبدوں" کی تعداد صرف تین تھی۔ اگر پیدائش کا اوسط روزانہ ۳۰۰ رکھا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہر ہر موبد کو روزانہ دو دو سو فاختہ یا کبوتر کھانے پڑتے تھے جو بالکل خلاف عقل ہے۔ اسوقت ایک عورت بچہ جننے کے بعد بالکل ناپاک سمجھی جاتی تھی، اگر وہ لڑکا جنتی تھی تو ۴۰ دن تک کسی مقدس چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی اور لڑکی جننے کی صورت میں پورے ۸۰ دن تک اس کی نجاست قایم رہتی تھی۔ پھر کیا کوئی وجہ اس کی بتائی جا سکتی ہے کہ بچہ جننا کیوں ایک عورت کو نجس و گناہگار بنا دیتا تھا اور یہ گناہ کبوتر یا فاختہ کے ذبح کرنے اور موبدوں کی شکم پُری کے بعد کیوں دور ہو جاتا تھا اور لڑکے لڑکی میں کیا فرق تھا کہ اُس کی ولادت کے بعد تو وہ صرف ۴۰ دن تک نجس قرار دیجائے اور اس کی ولادت کے بعد ۸۰ دن۔

الواح موسیٰ کے متعلق مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں ایک یہ کہ جب وہ خدا سے ہمکلام ہونے کوہ طور پر گئے تو وہاں دو تختیاں پتھر کی خدا کی طرف سے دی گئیں جن پر "احکام عشرہ" درج تھے، جب آپ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگوں نے سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ آپ بہت برہم ہوئے، تختیاں زمین پر پٹک کر توڑ ڈالیں، بچھڑے کو جلا کر اس کا سفوف پانی میں ملایا اور بنی اسرائیل کو اس کے پینے پر مجبور کیا۔

دوسری روایت میں نہ تختیوں کے توڑنے کا ذکر ہے نہ بچھڑے کا، تیسری میں "احکام عشرہ" کچھ اور بتائے گئے ہیں، آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ جب کوہِ سینا پر گئے تو بنی اسرائیل طلائی زیور ہارون کے پاس لائے اور انھوں نے اس زیور کو گلا کر سونے کا بچھڑا طیار کیا اور جب موسیٰ واپس آئے تو انھوں نے اس بت پرستی میں ان کو مبتلا دیکھ کر بہت غصہ کیا اور تین ہزار آدمی تہ تیغ کر دئے۔

قطع نظر اس سے کہ خدا کے ہمکلام ہونے اور اپنے پاس سے پتھروں کی منقوش تختیاں دینے کا تصور کس قدر ناقابل قبول ہے و راس میں کتنی مادیت پائی جاتی ہے جو خدا کے حقیقی مفہوم کے منافی ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اگر موسیٰ کے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی تھی تو انھوں نے خدا کے کس حکم کی نافرمانی کی۔ اس وقت تک احکام عشرہ لیکر موسیٰ واپس نہ آئے تھے اور کوئی شریعت قایم نہ ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل کو ایسے جرم میں ماخوذ کرنا جو فی الحقیقت اس وقت تک جرم ہی قرار نہ پایا تھا، انصاف سے بالکل بعید تھا۔ ہمیشہ قانون کے نفاذ کے

بعد جرم و سزا کی تعیین ہوا کرتی ہے، اور نفاذ شریعت سے قبل کوئی فعل قابل سرزنش نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ احکام عشرہ میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ فلاں بات کرو اور فلاں بات نہ کرو اور اس میں یہ کہیں درج نہ تھا کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی کی تو سزا دیجائے گی۔ قانون صرف یہی نہیں بتاتا کہ یہ فعل اچھا ہے یا بُرا بلکہ وہ اس سے نافرمانی کرنے والوں کی سزا بھی متعین کرتا ہے۔ اس لئے اگر احکام عشرہ کی تبلیغ کے بعد بنی اسرائیل سرتابی کرتے تو بھی وہ مستحق سزا نہ تھے، کیونکہ سزا کی تعیین احکام عشرہ میں پائی ہی نہیں جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ احکام عشرہ ہی تمام دنیا کے قانون و انصاف کی بنیاد ہیں، لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے ہزاروں سال قبل مصر میں جو قانون رائج تھا، اس میں نہ صرف چوری، زنا، قتل، جھوٹ وغیرہ کی سزائیں مقرر تھیں بلکہ تمدنی تعلقات کے سلسلہ میں اور جتنے جرائم ہو سکتے ہیں ان سب کی صراحت اس میں موجود تھی اور وہ "احکام عشرہ" سے بدرجہا زیادہ مکمل تھا۔ قانون ہمیشہ انفرادی و اجتماعی احساسِ تحفظ کے تحت بنا کرتے ہیں اور ضروریات تمدن اور مخصوص واقعات و حالات کے لحاظ سے ان میں تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے اس لئے تمام شریعتیں یا قوانین حقیقتاً نتیجہ ہیں انسان کے اجتماعی احساس کا اور اس میں الہام وغیرہ کے دخل کی کوئی توجیہ ممکن ہی نہیں۔

بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی عظمت و صداقت جلالت کے اعلان کے لئے بنی اسرائیل کا انتخاب کیا تھا اور اسی لئے وہ متعدد بار موسیٰ پر ظاہر ہوا۔ کوہ سینا کی بلندی پر آگ اور بادل کے ملبوس میں ظاہر ہوا اور ہزاروں معجزے بنی اسرائیل کی اصلاح و تعلیم کے لئے دکھائے۔ ان کی خاطر اس نے سمندر کے پانی کو شق کر دیا، آسمان سے روٹیاں برسائیں ان کی پیاس بجھانے کے لئے خشک چٹانوں سے چشمے پیدا کئے، ان کے دشمنوں پر طرح طرح کے عذاب نازل کئے الغرض چالیس سال تک ان کی حفاظت کی، لیکن پھر بھی بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر نازل ہوتی تھی تو وہ پتھر اور لکڑی ہی کے دیوتاؤں سے التجا کرتے تھے، پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہی خدا جس نے بنی اسرائیل کے لئے یہ سب کچھ کیا وہ ان کے دل میں اپنی صحیح عظمت و جلالت پیدا نہ کر سکا اور کیا بنی اسرائیل کی انھیں نافرمانیوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی برگزیدہ قوم تھی اور اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے اس نے اس قوم کا انتخاب کیا تھا۔

آپ نے مختصراً اس بیان کو سن لیا جو اسفارِ خمسہ میں تخلیق کائنات، آدم و حوا، بہشت و دوزخ، طوفان نوح، بنی اسرائیل کی ہجرت اور موسیٰ کے معجزات وغیرہ کے متعلق پایا جاتا ہے، لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جسے کوئی ذی عقل الہامی قرار دے سکے، اگر اسفار خمسہ کے الہامات ہیئت و جغرافیہ، تاریخ و فلسفہ، اصول تمدن و معاشرت وغیرہ میں سے کسی ایک کے متعلق بھی صحیح معلومات بہم نہیں پہونچا سکتے تو پھر اُن سے کیا فایدہ متصور ہے۔

اگر کہا جائے کہ انھوں نے خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی، تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ موسیٰ کی پیدائش سے بہت پہلے یہ عقیدہ موجود تھا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ انھوں نے حقوق ملکیت کی تعیین کی تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ چوری حضرت

سے پہلے بھی جُرم سمجھی جاتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قربانیاں کرنا انھوں نے سکھایا تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہودیوں کے وجود سے ہزاروں سال قبل قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں اسی طرح قتل، جھوٹ وغیرہ کو بھی ہمیشہ بُرا سمجھا گیا اور اسفارِ خمسہ میں اگر ان کو بُرا بتایا گیا تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پس یہ دعویٰ کرنا کہ اسفارِ موسیٰ کی تحریر بغیر الہام خداوندی کے ممکن ہی نہ تھی اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ ذہن انسانی سے بہت بلند ہے کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

گلیلو، سُرعتِ جوہری (Virtual Velocity) کے میکانکی اُصول بتاتا ہے، لیکن اسے الہامی نہیں کہتے، کوپرنیکس کرۂ زمین کی صحیح پوزیشن کو متعین کرتا ہے لیکن الہام سے اسے کوئی واسطہ نہیں، نیوٹن نظریۂ کشش ثابت کرتا ہے مگر اسے الہامی کوئی نہیں مانتا، اسی طرح اقلیدس، ڈیکارٹے، گلوائی، وولٹا، فرینکلن وغیرہ ریاضیات میکانکیات اور علم الکیمیا وغیرہ کے متعلق بیش بہا اختراعات و انکشافات پیش کرتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی الہامی نہیں مانی جاتی، لیکن اسفارِ خمسہ جن میں ایک کوئی بات بھی عقل سے تعلق نہیں رکھتی الہامی ہیں اور جو کوئی انھیں منجانب اللہ نہ سمجھے وہ بیدین و کافر ہے۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ چین، ہندوستان، مصر، یونان اور روما کے قوانین جو اس قدر مکمل تھے، دماغِ انسانی کا نتیجہ سمجھے جائیں اور اسفارِ خمسہ جو نہایت نامکمل شریعت کو پیش کرتے ہیں، ان کو الہامی قرار دیا جائے۔ کس قدر عجیب بات ہے!

پھر اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ موجودہ تہذیب نہ صرف یہ کہ مہمل چیز ہے بلکہ جُرم بھی ہے، اسفارِ خمسہ کی تعلیم کی رُو سے سیاسی آزادی کو جُرم قرار دینا چاہیئے اور شوہروں کو عام اجازت دیدینی چاہیئے کہ جب ان کے مزاج میں آئے اپنی بیویوں کو طلاق دیکر تباہ و خانماں برباد کردیں اور جتنی بیویاں چاہیں رکھیں، اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہونا چاہیئے کہ عورتوں کو لونڈیاں سمجھیں، کافروں کی اولاد خرید کے ان کو ہمیشہ کے لئے غلام بنالیں اور جب مزاج میں آئے ہلاک کردیں۔ رہی ذہنی آزادی سو اس کا تو نام لینا ہی شریعت موسوی میں بدترین جُرم ہے۔

محض یہ دعویٰ کہ اسفارِ خمسہ الہامی چیز ہیں، ہمیں اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ ہم اس کے اغلاط کو نظر انداز کرکے خواہ مخواہ اس دعویٰ کی تصدیق کریں۔ بلکہ ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اس غلط اعتقاد کو محو کریں کہ یہی اصل بنیاد ہماری ذہنی غلامی کی ہے۔

ہمیں نہایت آزادی سے اعلان کردینا چاہیئے کہ اسفارِ موسیٰ کے نظریۂ تخلیق، باغِ عدن، سانپ، شجرِ ممنوع، اور اخراج آدم و حوا وغیرہ کے قصے سب قدیم صنمیات کے ٹکڑے ہیں۔ عورت کبھی آدم کی پسلی سے پیدا نہیں ہوئی، سانپ میں کبھی قوت گویائی موجود نہیں تھی، طوفان نوح کا قصہ جیسا کہ بتایا جاتا ہے غلط ہے، برج بابل کی کوئی حقیقت نہیں ہے، موسیٰ کا عصا کبھی سانپ میں تبدیل نہیں ہوا، خدا نے کبھی مصریوں پر پے در پے عذاب نازل نہیں کئے

کوہِ طور پر وہ کبھی موسیٰ سے ہمکلام نہیں ہوا، اس نے من وسلویٰ کبھی آسمان سے نازل نہیں کیا، اس نے گوشت طلب کرنے پر بنی اسرائیل کو کبھی طاعون میں مبتلا نہیں کیا اور اگر ان تمام باتوں کے انکار سے اسفارِ خمسہ کی الہامی حیثیت مجروح ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوتی ہے بلکہ ان پر عاید ہوتی ہے جو محض افسانوں کو الہام خداوندی تسلیم کرانے پر اصرار کرتے ہیں اور مذہب کو صرف حماقت مآبیوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔

نوٹس بسبب دکھانے وجہ کے (نمونہ عام)

بعدالت جناب مسٹر اقبال حسین صاحب بہادر منصف شمالی مقام لکھنؤ

ابتدائی مقدمہ نمبر ۳۱۲ سنہ ۱۹۳۶ء

لالہ رامیشر پرشاد ولد لالہ بھگوان داس قوم کھتری ساکن محلہ رانی کٹڑہ شہر لکھنؤ ---------- مدعی

بنام

آغا محمد باقر ---------- مدعا علیہ

بنام۔ آغا محمد باقر ولد آغا محمد تقی ساکن حال شہر کانپور محلہ کرنل گنج برمکان انور علی خاں کوتوال نشیٹر متصل بشوالہ منازل ہرگاہ مسمیٰ مدعی سایل نے درخواست اس عدالت میں گزرانی ہے کہ قطعی ڈگری بحق مدعی خلاف مدعا علیہ مرتب کی جائے۔

لہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تم اصالتاً یا معرفت کسی وکیل کے جو حالات مقدمہ سے بخوبی واقف ہو بوقت دس بجے بتاریخ نو ۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء اس عدالت میں حاضر ہو کر درخواست کے خلاف وجہ دکھاؤ۔ اگر ایسا نہ کروگے تو درخواست مذکور تمھاری غیر حاضری میں سماعت کی جاوے گی۔

بتاریخ ۳۱ر ماہ اگست سنہ ۱۹۳۷ء میری دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

وقت حاضری بدفتر منصف صاحب بہادر شمالی لکھنؤ ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

مجنوں

اور اُس کا دیوان

عشق و محبت کا جذبہ، فطرتِ انسانی میں داخل ہے، اس لئے ملک و قوم کی شاعری میں عاشقانہ شاعری ہی نے زیادہ رواج پایا۔ اس میں شک نہیں کہ عشق و محبت کی دنیا بہت وسیع و پر لطف ہے اور انسان کی اجتماعی و انفرادی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس جذبہ سے متاثر نہ ہوا ور جاندار سمجھا جائے۔ وہ شعر جس کا موضوع عشق نہ ہو پھیکا ہے، ہر وہ افسانہ جس میں محبت کی چاشنی نہ پائی جاتی ہو بے مزہ ہے، ہر وہ تماشہ جس میں پریم کی کہانی نہ سنائی جائے بے لطف ہے اور ہر وہ نغمہ جس میں محبت کا راگ نہ گایا جائے سامعہ خراش ہے۔

اس کی چاشنی سے دنیا کا کوئی لٹریچر خالی نہیں ہے، وہ جادو نگاروں کے قلم میں زور پیدا کرتا ہے اور سحر بیان شعراء کے کلام میں طاقت، ہر زبان میں کچھ اس قسم کے ہیرو پائے جاتے ہیں جو اُس زبان کے لئے "روحِ ادب" بنکر رہ جاتے ہیں اور اُن کا نام لے لیکر شعراء اور انشاء پرداز "جہانِ عشق" میں بار بار آگ لگاتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی افسانوں میں سے "لیلیٰ و مجنوں" کی بھی داستان ہے گو یہ واقعہ صحرائے عرب کی خشک و بے آب و گیاہ سرزمین سے تعلق رکھتا ہے لیکن اُس کے درد و اثر نے کچھ ایسی غیر معمولی مقبولیت حاصل کی کہ عربی زبان ہی تک وہ محدود نہیں رہا بلکہ دُنیا کی تمام زبانوں میں داخل ہو گیا۔

"لیلیٰ و مجنوں" پر صدہا نظمیں اور مثنویاں اب تک لکھی جا چکی ہیں جن میں "نظامی" اور "ہاتفی" کی مثنویاں فارسی میں اور "ہوس" کی اُردو میں بہت مشہور ہیں۔ مگر اس سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ مجنوں کے کلام کا ایک مجموعہ عربی زبان میں بھی موجود ہے جو مصر و بیروت وغیرہ میں کئی بار شایع ہو چکا ہے اور اُس کے صحیح حالات اور دلی جذبات کا آئینہ دار ہے میں اسوقت اُس کے اسی کلام پر مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

مجنوں ایک رند مشرب انسان تھا وہ دراصل نہ شاعر تھا نہ مضمون نگار وہ فطرت کی طرف سے ایک حسین دل لیکر آیا تھا جسے وہ لیلیٰ کے قدموں پر نثار کر کے دین و دنیا سے بے خبر ہو گیا تھا، اُس کی شاعری کی کائنات صرف اسقدر تھی کہ جب

اُس کے دل میں محبت کی ہوک اُٹھتی تھی تو وہ اپنے جذبات اور واردات قلبی کو بلا تصنع نظم کر دیتا تھا۔ اس کے اشعار میں نہ شاعرانہ نازک خیالی تھی نہ بلند پروازی، مگر ہاں سوز و گداز، درد و اثر، حلاوت و شیرینی ضرور اُس کے کلام میں موجود تھی، اُس کا دیوان دراصل اُس کے مختصر "سوانح حیات" کا مجموعہ ہے، جہاں سے جی چاہے اُٹھا کر دیکھئے کہیں بھی آپ پھیکے اور بے مزہ شعر نہ پائیں گے ہر جگہ عشق کی لگاوٹ اور محبت کی حلاوت آپ کو نظر آئے گی۔

اُس کی شاعری تغزل کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ اُس کے دیوان میں کہیں "باب الفخر والہجاء" ہے، نہ "باب الادب والمراثی"، وہ صرف جذبات نگار شاعر تھا اور اُس کے اشعار سرتیز نشتر ہیں جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوز محبت کے سوا کچھ نہیں۔ غزل میں عام طور سے حسب ذیل مضامین پائے جاتے ہیں، عشق کی کرشمہ سازیاں، عاشق و معشوق کا راز و نیاز، وصل کی جستجو فراق و مہجوری کا بیان اور وحشت و جنوں وغیرہ۔

یہ تمام مضامین دیوان مجنوں میں بھی موجود ہیں، لیکن شاعرانہ نظم و نسق کے ساتھ نہیں بلکہ مجنونانہ بے ربطی کے ساتھ جو جستہ جستہ اُس کے حالات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔

مختصر حالات

مجنوں کا اصلی نام "قیس" تھا، وہ قبیلۂ بنو عامر کے ایک سردار "ملوح بن مزاحم" کا بیٹا تھا اُسکی معشوقہ کا نام "لیلیٰ" تھا، یہ بھی قبیلۂ بنو عامر کی ایک پاکدامن لڑکی تھی، ان دونوں میں بچپن ہی سے محبت ہو گئی تھی خود مجنوں کے اشعار بتاتے ہیں کہ قبل اس کے کہ سن بلوغ ان دونوں کے کان میں عشق کا افسوں پھونکے دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے، چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

تعشقت[1] لیلیٰ وھی غرۃ صغیرۃ	میں لیلیٰ کے عشق میں اُسوقت مبتلا ہو گیا تھا جب وہ بھولی بھالی کمسن لڑکی ہی تھی۔
وکنت ابن سبع ما بلغت الثمانیا	یعنی میں سات برس کا تھا اور ہنوز آٹھواں سال شروع نہیں ہوا تھا۔

اسی بچپن کے عشق نے طرح طرح کے واقعات مشہور کر دئے جو آج بھی زبان زد خلایق ہیں، اُنھیں میں سے ایک مکتب کا بھی واقعہ ہے جو پہلے کبھی تھیٹر میں دکھایا جاتا تھا اور آج کل سینما کے خوشنما اسکرین پر، مگر معتبر کتابوں سے اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

عشق کی ابتدا

قیس نہایت خوبرو اور طرحدار لڑکا تھا، اُس کے عشق کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ وہ ایک روز نفیس لباس پہنکر سیر و تفریح کے لئے گھر سے نکلا راستہ میں "لیلیٰ" سے ڈبھیڑ ہو گئی، نظریں چار ہوتے ہی دونوں ایکدوسرے کی طرف مایل ہو گئے، دونوں میں دیر تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور کچھ دیر بعد دونوں اپنے اپنے گھر چلے گئے، گھر واپس آنے کے بعد مجنوں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند کسی طرح نہ آئی، مجنوں اپنی اس حالت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:۔

---

[1] یہ اور بعد کے تمام آنے والے اشعار اور حوالجات میں نے "دیوان مجنوں" مطبوعۂ بیروت اور ایک مصری مصنف علامہ ابراہیم ذیدان کی کتاب "نوادر العشاق" سے نقل کئے ہیں جن صاحب کو دیکھنا ہو اصل دیوان اور نوادر العشاق کا مطالعہ کریں۔

اقضی نہاری بالحدیث و بالمنیٰ
ویجمعنی الہم باللیل جامع

دن تو خیر، میں باتوں اور آرزوؤں میں گزار دیتا ہوں
لیکن جب رات آتی ہے تو اپنے ساتھ رنج و غم کا طوفان ساتھ لے آتی ہے۔

امتحان و آزمایش رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان تعلقات بڑھنے لگے اور بڑی حد تک بے تکلفی پیدا ہوگئی، ایک دن لیلیٰ کے امتحاناً مجنوں سے بے توجہی برتی اور قصداً اُس سے بات نہیں کی، یہ دیکھ کر مجنوں کی حالت خراب ہوگئی۔ حسن کی نکتہ سنجیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ معشوق کے دل میں اپنے عاشق کے لئے گو جگہ ہے لیکن وہ اس کو کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دیتا چنانچہ لیلیٰ نے بھی اسوقت بڑے ضبط سے کام لیا اور اُس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا، مگر جب مجنوں کی حالت زیادہ خراب ہوئی اور وہ آپ ہی آپ دہاڑیں مار کر رونے لگا تو اُس سے نہ رہا گیا اور یہ جانتے ہوئے کہ ایسے مواقع پر محبت کا اظہار نہ صرف غیر ضروری بلکہ خلاف مصلحت بھی ہے اُس نے مجنوں کو بے اختیار اپنے سینہ سے لگا لیا اور برجستہ یہ شعر پڑھے:۔

۱۔ کلانا مظہر للناس بُغضًا
وکل عند صاحبہ مکین

ہم دونوں لوگوں کی نظروں میں کھٹک رہے ہیں
درانحالیکہ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کے دل میں گھر کر چکا ہے۔

۲۔ تخبرنا العیون بما اردنا
وفی القلبین ثم ھوی دفین

ہماری آنکھیں ہیں بتا رہی ہیں جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔
بیشک ہمارے دلوں میں محبت دفن ہے۔

اور ساتھ ہی اُس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "خدا کی قسم جتنی محبت تمھیں مجھ سے ہے اُس سے کسی طرح کم نہیں، اسوقت میں صرف تمھارا امتحان لے رہی تھی، اب میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ آج سے میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ تمھاری رہوں گی"۔

ہر چیز جب مرتبۂ کمال کو پہونچتی ہے اسی وقت اس کا اثر مرتب ہوتا ہے مگر عشق کا آغاز ویسا ہی لطف انگیز ہے جیسا اُسکا انجام ملاحظہ ہو، مجنوں اس موقع پر شراب محبت سے سرشار ہو کر کہتا ہے:۔

محا حبہا حب الالی کن قبلہا
وحلت مکانا لم یکن حل من قبل

اُس کی محبت نے زردجاہر کی محبت کو مٹا دیا ہے۔
اُسکی محبت ایسی جگہ پہونچ گئی ہے جہاں اس سے پہلے کبھی نہیں پہونچی تھی

راز و نیاز طالب و مطلوب دونوں کی طرف سے اس بات کی بیحد کوشش کی جاتی ہے کہ محبت کا راز فاش نہ ہونے پائے اس لئے ہر جگہ اُسے پردہ داری سے کام لینا پڑتا ہے، لیلیٰ کھری بیٹھنے والی ایک سنجیدہ، شریف طینت لڑکی تھی، گو عشق کا دیوتا اُس پر اپنا پورا قبضہ جما چکا تھا اور وہ مجنوں سے ملنے کے لئے ہر وقت بے چین رہتی تھی لیکن ساتھ ہی اُسے رسوائی کا بھی ڈر تھا اس لئے حالات جسقدر طشت از بام ہوتے گئے، اُتنی ہی دونوں میں فراق اور جدائی کی گھڑیاں طول پکڑتی گئیں۔ ادھر مجنوں اس صبر آزما جدائی کو برداشت نہ کر سکا اور کھانا پینا سب چھوڑ بیٹھا، ایک مرتبہ اُس کی ماں لیلیٰ سے ملی اور اُس سے کہا کہ "قیس کی حالت تیری وجہ سے بہت خراب ہے، اگر کسی طرح ایک مرتبہ چل کر تو اُسے دیکھ لیتی تو مجھے

یقین ہے کہ اُس کی حالت بہت کچھ بہتر ہو جاتی"۔ لیلیٰ یہ سنکر بہت افسردہ ہوئی، اُس نے آنے کا وعدہ کیا اور کسی ترکیب سے چھپ کر وہاں جا پہونچی، مجنوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ جنوں کے آثار طاری ہیں اور زندگی سے مایوسی ہے اُسے بڑا رنج پہونچا اُس نے اپنے فدائی مجنوں سے کہا "کیا تم نے میری وجہ سے اپنی یہ حالت بنائی ہے؟

مجنوں آبدیدہ ہو گیا اور بیک وقت دلنوازی اور جاں ستانی کی یہ عجیب و غریب ادا دیکھ کر چلا اُٹھا

۱۔ قالت جننت علی راسی فقلت لہا الحبُّ اعظم ممّا بالمحبین الحبّ لیس یفیق الدھر صاحبہ وانما یصرع المجنون فی الحین	اُس نے کہا، کیا تم مری وجہ سے دیوانہ ہو رہے ہو؟ میں نے اُس سے کہا، محبت دیوانگی سے کہیں بالاتر چیز ہے۔ محبت کرنے والے کو زمانہ کبھی چین لینے نہیں دیتا۔ مگر پاگل کی دنیا تو دیوانگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

عاشق اپنے شوق و آرزو کے مطابق محبوب سے لطف و التفات کی توقع رکھتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی وفادار سے وفادار محبوب بھی اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا، اس لئے عاشق کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ محبوب کے دل میں رحم نہیں۔

چنانچہ اُس روز جب لیلیٰ کچھ دیر کے بعد رسوائی کے خوف سے اُٹھ کر چلی گئی تو مجنوں کو یہی خیال ہوا کہ لیلیٰ کو میری حالت پر ذرا بھی رحم نہیں آتا دوسرے روز جب اُس نے حالت دریافت کرنے کے لئے پھر آدمی بھیجا تو مجنوں نے اُسکو مخاطب کر کے کہا

۱۔ تغود مریضاً استقمتہ بہجرھا ولا عادلہ عادلاً لا یعرف السقما	تم ایک ایسے مریض کی عیادت کر رہی ہو جسکو لیلیٰ کی جدائی نے ہمیشہ کے لئے بیمار ڈال دیا ہے، تم نے بیماری سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور انصاف سے کام نہیں لیا۔
۲۔ لقد اضرمت فی القلب ناراً من الہوی فما ترکت عظماً ولا ترکت لحماً	تم نے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی، تم نے جسم میں ہڈی اور گوشت کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

جدائی و فراق

لیلیٰ کے باپ کو اس واقعہ کی کسی طرح اطلاع ہو گئی، اُس نے اور زیادہ سختی سے لیلیٰ و مجنوں کے تعلقات کی روک تھام شروع کی اور حکومت سے امداد چاہی، مجنوں پر جب حکومت کی طرف سے دباؤ پڑا تو اُس نے ایک دلدوز آہ کھینچی اور کہا۔

الا حبت لیلیٰ و الیٰ امیرھا علیّ یمیناً جاھداً لا ازورھا واوعدنی فیہا رجالٌ ابوہم ابی وابوھا خشنت لی صدورھا	ہاں لیلیٰ مجھ سے پردہ میں ہو گئی ہے اور حاکم نے مجھ سے قسم لی ہے کہ میں پھر کبھی اُس کو نہ دیکھوں اُس کے بارے میں مجھے لوگ ڈراتے ہیں، افسوس ہے کہ میرے والد اور اُس کے باپ دونوں کے قلوب میرے لئے خشک ہو گئے ہیں۔

علیٰ غیر شیٔ غیر انی اُحبّہا
وانّ فوادی عند لیلیٰ اسیرھا

صرف اس جرم پر کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں
اور میرا دل لیلیٰ کے پاس گرفتار ہے۔

لیلیٰ کے اعزہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہاں سے وہ کوچ بھی کر گئے جس کی وجہ سے ایک مدت تک دونوں میں ملاقاتیں نہ ہو سکیں، ایک زمانہ کے بعد جب دونوں ملے تو گلہ و شکوہ کے بعد مجنوں نے رو رو کر کہا اپنا حال ان الفاظ میں بیان کیا:۔

ایا لیلیٰ زند البین یقدح فی صدری
ونار الاسیٰ ترمی فوادی بالجمر
فلا تحسبی یا لیلیٰ انی نسیتکم
فان مدی الایام ذکرک فی فکری
فواللہ لا انساک ما ھبت الصبا
وما ھطلت عینٌ علی واضح النہر

پیاری لیلیٰ! جدائی کا چقماق میرے سینہ کو زخمی کئے ڈالتا ہے،
اور رنج و غم کی آگ میرے دل کو پگھلائے ڈالتی ہے۔
لیلیٰ! یہ نہ سمجھنا کہ میں تجھے بھول گیا تھا،
تیری یاد مجھے ہمیشہ ستاتی رہتی ہے۔
خدا کی قسم میں تجھے نہیں بھولا، جب کبھی بادِ صبا چلی اور جب
کبھی چشمہ پر آنکھوں نے آنسو بہائے۔

لیلیٰ نے جب یہ اشعار سنے تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکی اور بے اختیار رو پڑی، مجنوں سے بھی نہ رہا گیا اور خود رفتگی کے عالم میں اُسے سینہ سے لگا لیا۔

محبت کی حقیقت

حسن نام رنگ روپ اور تناسب اعضا کا نہیں ہے بلکہ ان دلنواز اداؤں کا ہے جو دل میں چبھ جاتی ہیں، محبت کا ظاہری حسن یا جاہ و ثروت سے تعلق نہیں، محبت صرف روح سے ہوتی ہے اور اُن اداؤں سے جو باہمی ربط و ضبط کی وجہ سے دل میں جاگزین ہو جاتی ہیں۔

ظاہری حسن سے چند ہی دنوں میں جی بھر جاتا ہے، جسم کا تناسب ہی بہت جلد ایک قصہ ماضی بن جاتا ہے، دولت انقلاب زمانہ سے غائب ہو جاتی ہے، جاہ و مرتبہ حوادث روزگار سے گھٹ جاتا ہے لیکن محبت جس کا تعلق روح سے ہے نہ گھٹتی ہے نہ فنا ہوتی ہے اور نہ اُس سے کبھی جی بھرتا ہے۔

وہ محبت جو ان تغیرات سے اثر پذیر ہو محبت نہیں دھوکا ہے، فریب ہے، نفسانیت ہے، کہتے ہیں کہ لیلیٰ کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھی؛ جب لیلیٰ و مجنوں کی محبت کا افسانہ زیادہ شہرت پکڑ گیا اور لیلیٰ کے باپ نے مجنوں کے خلاف استغاثہ دائر کیا تو خلیفۂ وقت نے دونوں کو عدالت میں طلب کیا اور لیلیٰ کو دیکھ کر کہا "کیا یہی لیلیٰ ہے؟ جسکے لئے مجنوں اس طرح پریشان ہے"۔ مجنوں کو یہ حقارت آمیز بات سخت ناگوار ہوئی اور اُس نے کہا:۔

لو نظرت الی لیلیٰ من طاقات
اعین المجنون لابجلی لک بجتہا

اگر تو لیلیٰ کو مجنوں کی نظر سے دیکھتا تو تجھے اُس کی محبت
کی قدر ہوتی۔

ایک مرتبہ لوگوں نے مجنوں کو لیلیٰ سے بدظن کرنے کے لئے کہا کہ آخر تو لیلیٰ کی کس بات پر مرتا ہے، وہ تو بہت ہی بدصورت، پستہ قد اور کشادہ دہن لڑکی ہے، مجنوں کو لوگوں کی اس کوتاہ نظری پر بڑا رنج ہوا، اُس نے اس موقعہ پر جو شعر کہے تھے وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ یقول لی الواشون لیلی قصیرۃٌ
فلست ذرّاعًا عرض لیلی وطولہا

مجھ سے چغلخور کہتے ہیں کہ لیلیٰ پستہ قد ہے،
میں لیلیٰ کا عرض و طول ناپنے والا نہیں ہوں

۲۔ وان بعینیہا لعمرک شہلۃٌ
فقلت کرام الطیر شہل عیونہا

یہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ اُس کی آنکھیں بھوری ہیں، میں کہتا ہوں کہ شریف پرندے وہی ہیں جن کی آنکھیں بھوری ہوتی ہیں۔

۳۔ وجاحظۃٌ فوھاء لا باس انہا
منی کبدی بل کل نفسی سوٰلہا

لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑے بڑے دیدوں والی اور کشادہ دہن ہے، میں کہتا ہوں کوئی حرج نہیں، وہ میرا دل و جگر ہے اور میری جان آرزو ہے

۴۔ فدق صلاب الصخر راسک سرمداً
فانی الی حین الممات خلیلہا

تم اپنا سر ہمیشہ پتھروں سے ٹکراتے رہو
میں مرتے دم تک اُسی کا جاں نثار رہوں گا۔

ایک مرتبہ مجنوں کے اعزہ نے بھی اُس کو ملامت کی اور کہا کہ لیلیٰ کی محبت سے باز آ، اور کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرلے، شاید یہ تیرا جنون جاتا رہے۔ مجنوں نے اُن کو جواب دیتے ہوئے کہا:۔

۱۔ لقد لامنی فی حب لیلی اقاربی
ابی وابن عمی وابن خالی وخالیا

لیلیٰ کی محبت کے بارے میں میرے اعزہ مجھے ملامت کرتے ہیں،
میرے والد، میرے چچا اور میرے رشتہ کے بھائی۔

۲۔ یلومون قیسًا بعد ما شقہ الہوی،
وبات یراعی النجم حیران باکیًا

وہ قیس کو اُسوقت ملامت کرتے ہیں جبکہ محبت نے اُسکو پارہ پارہ کردیا ہے
اور جبکہ وہ رات ستارے گن گن کر روتا ہوا اور پریشان گزارتا ہے۔

۳۔ فیا عجبًا ممن یلوم علی الہوی،
فتیً دنفًا امسیٰ من الصبر عاریا

تعجب ہے کہ لوگ محبت پر ایک ایسے نوجوان کو ملامت کرتے ہیں
جو مدت سے اُس میں مبتلا ہے اور صبر کی تاب نہیں رکھتا۔

۴۔ ینادی الذی فوق السمٰوات عرشہٗ
لیکشف وجدًا بین جنبیہ ثاویا

وہ پکارتا ہے اُس خدا کو جس کا عرش آسمانوں کے اوپر ہے تاکہ
وہ اُس غم کو دور کردے جو اُس کے پہلوؤں میں دبا ہوا ہے

۵۔ یبیت بجمع الہم مالیطعم الکرٰے
ینادی الٰہی قد لقیتُ الدواہیا

وہ رنج و غم کے بستر پر رات گزارتا ہے اُسے نیند نصیب نہیں۔
وہ پکارتا ہے خداوندا، میں نے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔

۶۔ بساحرۃ العینین کالشمس وجہہا
یضیٔ سناھا فی الدجی متسامیا

ایک جادو بھری نظروں والی کی وجہ سے جس کا چہرہ مثل آفتاب
کے تاریکی میں بھی اپنی روشنی پھیلاتا رہتا ہے۔

بدچلنی کا بہتان

عشق انسان کے اخلاق کو سدھارتا ہے اُس کے مذموم عادات شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں، نفسانیت اور شہوانی خواہشات مٹ جاتے ہیں، بغض و حسد، مکر و فریب، فسق و فجور، اور تمام وہ عادات جس کا تعلق اخلاق رذیلہ سے ہے ایک کر کے فنا ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں؟ صرف اس لئے تاکہ عاشق اپنے آپ کو محبوب کی نظروں میں شریف ثابت کر سکے اور اُسکے دل میں اپنے لئے گنجایش پیدا کر سکے، کسی نے سچ کہا ہے، "الحبّ ربانی وعلمنی الادب"۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص کسی سچے عاشق پر بدچلنی کا بہتان لگائے تو ظاہر ہے اُسے سخت صدمہ ہوتا ہے، چنانچہ قبیلۂ بنو اسد کے جب کچھ لوگوں نے مجنوں پر بدچلنی کا الزام لگایا تو اُسے بے انتہا رنج ہوا جو اُس کے حسب ذیل کلام سے ظاہر ہوتا ہے:۔

۱۔ الا ایہا القوم الذین وشوبنا	اے لوگو! جو مجھ پر الزام لگاتے ہو
علی غیر ما تقوی الالٰہ ولا برّ	بغیر کسی نیک نیتی اور خوف خدا کے
۲۔ الم ینہکم عنا تقاکم فتنتہوا	کیا تمہارا تقوی تم کو اس سے باز نہیں رکھتا؟
ام انتم اناس قد جُبلتم علی الکفر	کیا تم وہ ہو جن کی سرشت میں کفر داخل ہے
۳۔ تعالوا نقف صفین منا ومنکم	آؤ، ہم اپنی اور تمہاری دو صفیں قایم کریں،
وندعوا الٰہ الناس فی وضح الفجر	اور علی الصباح خدا سے بد دعا کریں۔
۴۔ علی من یقول الزور ادیطلب الخنا،	اُس شخص کے لئے جو جھوٹ بولتا ہے اور بہتان لگاتا ہے اور
ومن یقذف الخود الحصان ولا یدری	جو نوجوان پاکدامن عورتوں پر بغیر علم کے تہمت لگاتا ہے۔
۵۔ حلفت بمن صلّت قریش وحجرت	میں قسم کھاتا ہوں اُس ذات کی جس کے لئے قریش نمازیں
لہ بمنیً یوم الافاضۃ والنحر	پڑھتے ہیں اور جسکے نام پر منیٰ میں قربانی کے روز رمی جمار کرتے ہیں
۶۔ لقد اصبحت منی حصانا بریئۃً	کہ لیلی پاکدامن ہے، وہ فحش اور ناجائز باتوں سے
مطہرۃً لیلی من الفحش والنکر	کبھی ملوث نہیں ہوئی،
۷۔ ھی البدر الحسناء والنساء کواکب	وہ پر جمال ماہتاباں ہے، دوسری عورتیں اُسکے مقابلہ میں ستارے ہیں
فشتّان ما بین الکواکب والبدر	اور یہ ظاہر ہے کہ ماہ کامل اور ستاروں کے درمیان کتنا فرق ہے
۸۔ علیہا سلام اللہ من ذی صبابۃ	اُس پر خدا کی سلامتی ہو جو ایک عاشق دل گیر کی طرف سے
وصب مُعنًّی بالوساوس والفکر	طرح طرح کی فکروں اور وسوسوں میں مبتلا ہے۔

محبت کرنے والے کے لئے کوئی چیز قابل نفرت نہیں رہتی اُسے دنیا کی ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ دشمن سے بھی دشمنی کا خیال نہیں رہتا، عداوت محبت ہو جاتی ہے، بخل فیاضی بن جاتا ہے نخوت و غرور نیاز و فروتنی سے بدل جاتا

ہے، پست ہمتی کے بجائے بلند حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے

کسی نے ایک مرتبہ طعنہ دیکر مجنوں سے کہا کہ لیلیٰ تو بیمار ہو کر عراق گئی ہوئی ہے اور اُس کی بری حالت ہے، مگر تمھیں کچھ خبر نہیں، یہ سنکر مجنوں بیہوش ہو گیا جب ذرا حواس درست ہوئے تو اُس نے کہا:۔

۱۔ یقولون لیلی بالعراق مریضۃ
فمالک لا تضنیٰ وانت صدیق

لوگ کہتے ہیں کہ لیلیٰ عراق میں بیمار پڑی ہوئی ہے تمھیں کیا ہو گیا کہ تم کمزور و لاغر نہیں ہوتے حالانکہ تم اُس کے شیدائی ہو۔

۲۔ سقی اللہ مرضی بالعراق فانہ
علی کل مرضی بالعراق شفیق

خدا عراق کے مریضوں کو اچھا کرے، میں وہاں کے تمام بیماروں سے ہمدردی رکھتا ہوں۔

۳۔ اُھیم باقطار البلاد وعرضہا
ومالی الی لیلی الغداۃ طریق

میں شہروں شہروں مارا مارا پھرتا ہوں
مگر دوشیزہ لیلی کی طرف مجھے راستہ نہیں ملتا۔

۴۔ اذا ذکرتہا النفس ماتت صبابۃً
لہا زفرۃٌ قتالۃٌ وشہیق

دل اُسے جب یاد کرتا ہے تو سوزش عشق سے مر کر رہ جاتا ہے
اُس میں ایک ہوک اُٹھتی ہے اور جان لیوا فریاد۔

۵۔ سقتنی شمسٌ یخجل البدر نورہا
ویکسف ضوء البرق وہو یروق

مجھے ایک ایسے آفتاب نے سیراب کیا ہے جس کا حُسن ماہ کامل کو شرمندہ کرتا ہے اور بجلی کی چمک کو خیرہ کر دیتا ہے جب وہ کوندتی ہو۔

۶۔ اُریٰ جبہا جسمی وقلبی ومہجتی
فلم یبق الا اعظمٌ ودکروبُ

میں دیکھتا ہوں کہ اُسکی محبت میرا جسم، میرا دل اور میری جان ہے
مجھ میں سوائے رنج و غم اور ہڈیوں کے کچھ باقی نہیں رہا۔

۷۔ الی اللہ اشکو ما اُلاقی من الہویٰ
بلیلی ففی قلبی جویً وحریقُ

میں خدا سے اُن مصیبتوں کی شکایت کرتا ہوں جو لیلیٰ کی محبت میں مجھ پر نازل ہوئیں اس لئے کہ دل میں ابتک ایک سوزش ہے اور محبت کی تپش۔

عشق کی بلا انگیزی

جب مجنوں کی حالت زیادہ غیر ہوتی گئی تو لوگوں نے اُس کے باپ کو مشورہ دیا کہ اسے حج کیلئے لیجاؤ، شاید خدا اپنا فضل کرے، اُس کے باپ نے یہ بھی کر دیکھا، جب مجنوں خانۂ کعبہ پہونچا تو اُس کے باپ نے کہا کہ کعبہ کے پردہ پکڑ کر یہ دعا مانگو۔

یا من احتجبتَ عن العیون
اَرِحنی من حبِّ لیلی وازل عنی
ہذا الجنون، فقال القیسُ،
ایہا الالٰہ الحی! انی تائبٌ

اے وہ ذات جو نظروں سے پوشیدہ ہے
مجھے لیلیٰ کی محبت سے نجات دے اور مجھ سے اس جنون کو دور کر،
قیس نے کہا:۔ خداوندا، میں تمام گناہوں سے

الیک عن جمیع الخطایا الا
عن حُبِّ لیلی فانّنی لا اتوب،

توبہ کرتا ہوں مگر میں لیلی کی محبت سے باز نہیں رہ سکتا۔

عشق میں گو درد، مصیبت، رنج وغم سب کچھ پیش آتا ہے اور ہزاروں قسم کے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں تاہم ان سب باتوں کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی کوئی کیفیت اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ملاحظہ ہو مجنوں کہتا ہے۔

۱۔ یقولون تُب عن حبّ لیلی و ذکرھا
وتلک لعمری توبۃ لا اتوبھا،

لوگ کہتے ہیں کہ لیلی کی محبت اور اُس کے ذکر سے توبہ کر، لیکن یہ ایک ایسی توبہ ہے کہ اپنی جان کی قسم میں نہیں کر سکتا۔

۲۔ یقر بعینی قربھا و یزیدنی
بھا عجبًا من کان عندی یُعیبھا

اُس کی قربت میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، مجھے اُن لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو میرے نزدیک اُس پر عیب لگاتے ہیں۔

۳۔ فیا نفس صبرًا لستِ واللہ فاعلمی
باوّل نفسٍ غابَ عنہا حبیبھا

اے دل صبر کر، خدا کی قسم تو اُن میں کا پہلا نہیں جسکا محبوب اُس سے غائب ہو گیا ہو۔

یہ سن کر باپ نے کہا، بیٹے! کیا تو اُس کے بغیر کسی طرح صبر نہیں کر سکتا۔ مجنوں نے کہا، خدا کی قسم میں سخت بیچینی میں مبتلا ہوں، مجھے کسی طرح اُس کے بغیر چین نہیں پڑتا اور پھر اُس نے یہ شعر پڑھے:۔

۱۔ وکم قائلٍ لی اُسلُ عنہا بغیرھا
وذلک من قول الوشاۃ عجیبُ

بہت سے کہنے والے مجھے کہتے ہیں کہ تو اپنے دل کو کسی اور سے تسلی دے، چغلخوروں کی یہ بات عجیب ہے۔

۲۔ فقلت لعینی تسہل دموعھا
وقلبی باکناف الحبیب یذوبُ

میں نے آنکھوں سے کہا کہ آنسو بہا،
درانحالیکہ میرا دل محبوبہ کے پہلو میں پگھل رہا ہے۔

۳۔ لئن کان لی قلبٌ یذوب بذکرھا
وقلبٌ باخریٰ انہا لقلوب

اگر مجھے ایسے دل ملیں جو اُس کی یاد میں پگھل جائیں تو بیشک وہی "دل" ہیں۔

۴۔ فیا لیلی، جودی بالوصال فانّنی
بحبک رھنٌ والفواد کئیبُ

پیاری لیلیٰ! اپنے وصال سے مجھے سرفراز کر، بیشک میں تیری محبت میں گرفتار ہوں، اور دل زخمی ہے۔

۵۔ فلا تترکی نفسی شعاعًا فانہا،
من الوجد قد کادت علیک تذوبُ

میرے دل وجان کو پراگندہ نہ کر، بیشک وہ تیرے غم میں عنقریب پگھل جائیں گے۔

۶۔ والبقی من الحب المبرح سورۃً
لہا بین جلدی والعظام دبیبُ

سوزش عشق کو باقی رکھ، جس کی ایک چنگاری میرے جسم اور ہڈیوں میں دبی ہوئی ہے۔

(باقی)

جلیل الرحمٰن اعظمی

نانجور کے بابو

(۱)

ایک زمانے میں نانجور کے بابو تمام بنگال میں مشہور تھے۔ وہ دولتمند اور ذی رتبہ تھے۔ لوگ نہایت عزت کے ساتھ انکا نام لیتے تھے۔ ان کی شہرت کا خاص سبب ان کی شاہ خرچی تھی، ان کی طبیعت کی نزاکت کی یہ حد تھی کہ ڈھاکے کی ململ سے بھی ان کا جسم چھل جاتا تھا اور وہ غصہ میں آکر اسے پھاڑ ڈالتے تھے۔ وہ اپنی بلی کے بچّہ کی شادی میں ہزار ہا روپیہ خرچ کر ڈالتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک محفل میں رات کو دن بنانے کے لئے انھوں نے بیشمار لیمپ روشن کئے تھے اور چاندی کی افشاں کاٹ کر ہوا میں اڑائی تھی تاکہ روشنی کے عکس میں آفتاب کی شعاعیں معلوم ہوں۔

سیلاب سے پیشتر ان کا یہ زمانہ تھا۔ مگر سیلاب آنے کے بعد اور خاندانوں کی طرح یہ خاندان بھی اپنی قدیم حیثیت زیادہ دن تک قدیم نہیں رکھ سکا۔ ان کے شاہانہ عادات میں بہت فرق آگیا۔ ان کی مثال ایسے چراغ کی ہوگئی جس میں بہت سی بتیاں پڑی ہوں جو بہت جلد تیل چوس لیں اور چراغ گل ہو جائے۔

کیلاش بابو اس مشہور خاندان کے آخری رکن، گزشتہ شان و شوکت کے عہد کی آخری یادگار اور ہمارے پڑوسی ہیں۔ ان کی جوانی سے پہلے ہی یہ خاندان تقریباً مفلسی کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو خاندانی شان و شکوہ کا آخری مظاہرہ ان کی موت کے رسوم میں ہوا اور اس کے بعد وہ دیوالیہ ہو گئے۔ ان کی تمام جائداد قرضخواہوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئی۔ تھوڑا بہت روپیہ جو باقی تھا وہ قدیم خاندانی وقار اور عزت کو قایم رکھنے کے لئے ناکافی تھا لہذا وہ نانجور چھوڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کے دل پر خاندان کی تباہی کا اتنا اثر تھا کہ وہ بیچارہ اسی رنج میں مر گیا اور ایک لڑکی چھوڑ گیا۔ کلکتہ میں کیلاش بابو کا مکان ہمارے مکان کے برابر ہے۔

ہمارے خاندان کے حالات اس خاندان کے حالات سے بالکل برعکس ہیں۔ میرے والد نے تنہا اپنی محنت سے روپیہ پیدا کیا۔ ان کو اس بات پر فخر تھا کہ کبھی ایک پیسہ ان کے ہاتھ سے بیجا نہیں صرف ہوا۔ وہ بالکل سادہ لباس پہنتے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک معمولی مزدور کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ فضول خرچی کر کے بابو کا خطاب یا القاب حاصل کریں۔ میرے

دل میں ان کی بے انتہا قدر ہے۔ انھوں نے مجھے بہترین تعلیم دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج میں صرف اپنی قوت سے دنیا میں اپنی حیثیت قائم کرنے کے قابل ہوں، مجھے اپنے تئیں نو دولت کہتے ہوئے بالکل شرم نہیں آتی۔ مجھے صندوقچیوں تہ کئے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں زیادہ عزیز ہیں لیکن ایسا وقار اور ایسا خطاب جس کے ساتھ میرے باپ دادا کا روپیوں کا حساب و تپرخوانی برابر ہوتا ہے نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے مجھے کیلاش بابو کی صورت دیکھ کر ان سے نفرت پیدا ہوتی تھی کہ وہ باوجود مفلس ہونے کے اپنی شان اور عزت کو باقی رکھنے کی کوشش میں بڑھ بڑھ کے باتیں کیا کرتے تھے۔ اور شاید وہ بھی مجھے اس لئے حقیر سمجھتے ہوں کہ میرے والد نے اپنی محنت سے دولت پیدا کی تھی۔

افسوس! مجھے اس کا لحاظ کرنا چاہئے تھا کہ میرے سوا کوئی شخص بظاہر کیلاش بابو سے نفرت نہیں کرتا ہے بیشک ان سے زیادہ کوئی بے ضرر انسان نہ تھا۔ وہ ہر خوشی اور رنج کے موقع پر خجلت اور خلوص کے ساتھ سب کے شریک رہتے تھے۔ وہ اپنے جوار میں ہر ایک کے یہاں مذہبی اور غیر مذہبی رسوم میں شرکت کیا کرتے تھے۔ بوڑھا، جوان، بچہ سب سے وہ ہنس کے اور محبت سے بات کرتے تھے۔ ان کا خلوص اور ان کے دل کی صفائی اس سے ظاہر ہوتی تھی کہ وہ ہر ملاقاتی سے اس کی اور اس کے گھر کی خیریت پوچھا کرتے تھے۔ راستے میں جو دوست ان کو ملجاتا تھا اسے اپنے کوٹ کے بٹن کھول دینا پڑتے تھے کیونکہ صورت دیکھتے ہی ان کی زبان پر سوالات کا ایک سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔

"اخاہ - دوست۔ اسوقت تمھیں دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ کہو مزاج تو اچھا ہے؟ شانتی کیسی ہے؟ اور دادا؟ وہ بھی اچھے ہیں؟ میں نے سنا تھا کہ بادھوے لڑکے کو بخار آگیا ہے۔ اب وہ کیسا ہے؟ اور ہاں۔ ہری چرن بابو۔ ان کو بہت دن سے نہیں دیکھا ہے۔ تمھیں معلوم ہے؟ خدانہ کرے کچھ بیمار تو نہیں ہیں؟ رکھل کا کیا حال ہے؟ اور تمھارے گھر میں سب کیسے ہیں؟"

کیلاش بابو کے پاس کپڑے بہت کم تھے مگر ان کا لباس بہت صاف رہتا تھا۔ وہ اپنے کپڑوں کو، پلنگ کی چادر اور تکیوں کو حتی کہ اس غالیچے کو جس پر وہ بیٹھتے تھے روزانہ دھوپ دیا کرتے تھے اور صاف کیا کرتے تھے۔ برابر یہ ہوتا تھا کہ وہ باہر کا دروازہ بند کر کے خود کپڑے دھوتے تھے اور انھیں سکھا کر اور استری کر کے سلیقہ سے کھونٹی پر ٹانگ دیتے تھے ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے فراغت کر کے وہ دروازہ کھول دیتے تھے اور لوگ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ ان کا مختصر غریبانہ اس سلیقہ سے رکھا تھا گھر اچھا معلوم ہوتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ضرورت کے وقت اور فرنیچر بچھایا جا سکتا ہے۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کیلاش بابو کی تمام جایداد ضائع ہو چکی تھی۔ مگر چند خاندانی چیزیں ان کے پاس باقی رہ گئی تھیں جو بمشکل انھوں نے قرضخواہوں کے پنجہ سے بچائی تھیں۔ ان اشیاء میں ایک چاندی کا گلاب پاش ایک قیمتی عطردان ایک کشتی۔ ایک پرانی شال۔ باپ دادا کے چند عمدہ جوڑے اور ایک پگڑی۔ یہ چیزیں بیچارے کے پاس رہ گئی تھیں۔ ان چیزوں کو مناسب وقتوں پر وہ احباب کے سامنے لا کر نانجور کے بابوؤں کی قدیم عزت بچانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے غیور آدمی تھے اپنی زندگی کو پرانی عزت اور ساکھ کے ساتھ گزارنے جانے کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے دوست خوش مزاجی کے ساتھ

ں کی باتیں سنا کرتے تھے اور ان سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

محلہ کے سب لوگ انھیں ٹھاکر دادا کہتے تھے۔ لوگ برابر ان کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور گھنٹوں انکے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ سب ان کی حالت کو سمجھتے تھے لہذا سب کو خیال رہتا تھا کہ ان لوگوں کے بیٹھنے میں بیچارے کا کچھ خرچ نہ ہونے پائے اور روزانہ کوئی نہ کوئی تھوڑا سا تمباکو لے آتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ ٹھاکر دادا آج مجھے ایک صاحب نے گیا سے تمباکو بھیجا تھا۔ میں آپ کے لئے بھی لیتا آیا۔ ذرا اسے پی کے دیکھئے آپ کو پسند آتا ہے کہ نہیں۔ یونہی روز ہر شخص ایک نہ ایک بہانہ کر دیا کرتا تھا۔ ٹھاکر دادا اسے پی کے کہتے تھے کہ ہاں خوب ہے۔ پھر وہ بیان کرنے لگتے تھے کہ بہت دن ہوئے ہم نے نانپور میں ایک مرتبہ خود تمباکو بنایا تھا جو ایک گنی نئی اونس میں تیار ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ کہتے تھے کہ مگر معلوم نہیں تمھیں پسند آئے گا یا نہیں تم پینا چاہو تو لاؤں۔ اب میرے پاس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔

ہر شخص جانتا تھا کہ اگر "ہاں" کہدی تو یا تو تمباکو کے کمبس کی کنجی گم ہو گی یا یہ جواب ملیگا کہ گنیش (جو ان کا پرانا باپ کے وقت کا ملازم تھا) نے کہیں رکھا ہے اور اس کے بعد وہ کہیگا کہ خدا جانے وہ چیزیں کہاں رکھ کے چلا جاتا ہے۔ بھئی یہ گنیش بھی میں کہتا ہوں بڑا احمق ہے۔ مگر پرانا نوکر ہے اس لئے میرے دل سے نہیں ہوتا کہ اسے علحدہ کر دوں۔

بیچارہ گنیش بھی خاندان کی عزت بنی رہنے کے خیال سے یہ سب الزام گوارا کر لیتا تھا۔ وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ سب سن لیتا تھا اور کبھی کوئی حرف زبان پر نہیں لاتا تھا۔ پاس بیٹھنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی کہدیتا تھا کہ ٹھاکر دادا غصہ نہ کیجئے رہنے دیجئے۔ وہ تمباکو بہت قیمتی ہے۔ ہم لوگ اسے پی بھی نہیں سکیں گے۔ اس طرح کی باتوں سے ٹھاکر دادا کے دل کو سکون ہو جاتا تھا۔ وہ خاموش ہو جاتے تھے اور دوسری باتیں ہونے لگتی تھیں۔ جب لوگ ٹھاکر دادا کے پاس سے جانے لگتے تھے تو وہ انھیں دروازے تک پہونچانے آتے تھے اور چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہتے تھے "اچھا یہ بتاؤ تم لوگ ہمارے ساتھ کھانا کب کھاؤ گے؟" کوئی شخص جواب دیدیتا تھا کہ "ٹھاکر دادا، دیکھئے ہم خود کوئی دن مقرر کر لیں گے۔" اس پر وہ جواب دیتے تھے کہ اچھی بات ہے۔ ابھی گرمی بھی بہت تیز پڑ رہی ہے۔ برسات میں زیادہ لطف رہے گا۔ جیسی میں تم لوگوں کی دعوت کرنا چاہتا ہوں اس سے اس گرمی میں تم پریشان ہو جاؤ گے۔" لیکن جب برسات آئی تو ہر شخص نے احتیاط کی کہ انھیں دعوت یاد نہ دلائی جائے اور اگر اتفاقاً کبھی ذکر دعوت کا ذکر آگیا تو کوئی شخص مناسب عنوان سے کہدیتا تھا کہ آجکل بارش ایسی ہو رہی ہے کہ گھر سے نکلنا بھی دشوار ہے برسات کے بعد دعوت ہو تو اچھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یونہی یہ کھیل بڑھتا جاتا تھا۔

ان کا مختصر مکان ان کی خاندانی حیثیت کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ اس بارے میں بھی لوگ ان کی تسلی کر دیا کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس مکان میں تکلیف ہے مگر یہاں کلکتہ میں اچھا مکان ملنا بہت دشوار ہے۔ ہم آپ کے لئے کئی سال سے عمدہ مکان کی تلاش میں ہیں مگر ابتک آپ کے لایق مکان ہمیں نہیں ملا ہے۔" یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ درحقیقت کوئی دوست ایسا احمق نہ تھا جس نے دراصل مکان تلاش کیا ہو۔

ٹھاکر دادا ٹھنڈی سانس لیکر کہتے تھے کہ خیر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے مجبوراً اسی مکان میں رہنا پڑے گا۔ پھر وہ مسکرا کے کہتے تھے، کہ مجھے تکلیف اٹھانا منظور ہے، لیکن اپنے دوستوں کو چھوڑنا میرے دل کو نہیں گوارا ہے۔ میں تم لوگوں سے قریب ہوں۔ اس آرام کے مقابلہ میں مجھے کوئی تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔

میری طبیعت کو یہ باتیں بہت ناگوار تھیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ نوجوانی میں انسان کو حماقت سب سے بڑا جرم نظر آتا ہے۔ مگر کیلاش بابو بیوقوف نہ تھے۔ بلکہ وہ بہت سنجیدہ اور سنجیدہ تھے کہ لوگ اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔ صرف نانجور کے بارے میں وہ ایسی لغو اور مہمل باتیں بیان کرتے تھے جنھیں کوئی شخص نہیں مان سکتا تھا اور نہ وہ کسی ذی شعور انسان کی زبان سے نکل سکتی تھیں۔ لیکن چونکہ لوگوں کو ان سے محبت بھی تھی اور ان کی باتیں بھی پسند تھیں اس لئے ان کے قول کی وہ کبھی تردید نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر خود انھیں کے بیان کردہ قصوں کو ان کے سامنے دہرا دیتے تھے جس سے وہ خوش ہو جاتے تھے اور انھیں شبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ لوگ ہماری بات کا یقین نہیں کرتے ہیں۔

(۲)

جب میں تنہائی میں بیٹھکر کیلاش بابو کے متعلق اپنے خیالات اور احساسات پر غور کرتا تھا تو مجھے ان سے نفرت کے اور بھی سبب نظر آنے لگتے تھے۔ اب میں انھیں صاف صاف بیان کئے دیتا ہوں۔

گو میں ایک رئیس کا لڑکا ہوں اور ممکن ہے کہ میں نے کالج میں اپنا قیمتی وقت تھوڑا بہت ضایع کیا ہو مگر اس پر بھی میں اتنی محبت کرنے والا آدمی ہوں کہ بہت کم عمری میں میں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ میرے چال چلن میں کوئی عیب نہ تھا۔ صورت شکل میری ایسی تھی کہ اگر میں خود اپنی زبان سے اپنے تئیں حسین کہتا تو بھی کوئی مجھے جھوٹا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ لوگ یہ کہتے کہ اسے اپنے حسن پر ناز ہے مگر میرے حسن سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

میرے ماں باپ بھی یہ سمجھتے تھے کہ بنگال میں سب سے حسین لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا میرے سوا کوئی نوجوان میرے برابر حقدار نہیں ہے۔ اور نیز میرا یہ خیال تھا کہ شادی کے سودے میں میں اپنی پوری پوری قیمت حاصل کروں گا۔ جب میں اپنی شادی کا تصور کرتا تھا تو میرے ذہن میں ایسی لڑکی کا تصور آتا تھا جو بہت دولتمند ہو اور حسن میں یکتا ہو۔ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہو اور اعلیٰ تعلیمیافتہ ہو۔ میری نسبتیں قریب اور دور ہر جگہ سے برابر آتی رہتی تھیں۔ لڑکی والوں کی طرف سے میرے لئے بڑی بڑی نقد رقمیں پیش کی جاتی تھیں میں نہایت انصاف کے ساتھ ان رقموں کا اپنے حسن کی حد سے مقابلہ کرتا تھا اور میری نظر میں وہ سب رقمیں معیار سے کم ثابت ہوتی تھیں۔ یہاں تک نوبت پہونچی کہ آخر میں مجھے شک پیدا ہو گیا کہ شاید بنگال بھر میں میرے لائق کوئی حسینہ موجود ہی نہیں ہے۔ اور دراصل میری خوشروئی کے ذکر بنگال میں ہر شخص کی زبان پر جاری تھے اور ہر گھر میں میرے حسن کی تعریف ہوتی تھی۔

جو لوگ میری تعریفیں کرتے تھے ان سے میں خوش ہوتا تھا یا نہیں یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا

ہوں کہ ان کی تعریفوں سے میں ناراض نہیں ہوتا تھا۔ میں ان کی زبانی اپنی توصیف کرنا اپنا حق سمجھتا تھا کیونکہ واقعی حسین تھا
یہ میں بیان کر چکا ہوں کہ ٹھاکر دادا کی ایک ہی پوتی تھی میں نے بارہا اسے دیکھا تھا لیکن اسے خوبصورت نہیں سمجھتا تھا
میرے دل میں اس کا وہم بھی نہ تھا کہ اس لڑکی کا میری شریک زندگی ہونا ممکن ہے۔ البتہ اس کی ضرور توقع تھی کہ کیلاش بابو
ایک نہ ایک روز عبادت سمجھ کر اسے میری بارگاہ میں پیش کریں گے۔ اصل پوچھئے تو یہی میری ان سے نفرت کا سبب تھا کیونکہ
ابتک میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی اور مجھے یہی بات ناگوار اور خلاف مزاج ہوئی تھی۔
میں نے دوستوں کی صحبت میں کیلاش بابو کو یہ کہتے سنا تھا کہ نانجور کے بابوؤں نے خود کبھی کسی سے سوال نہیں کیا ہے
اور میں بھی اس وضع کو اپنی زندگی تک نہیں چھوڑوں گا اور اس خاندانی رسم کو نہیں توڑوں گا چاہے میری پوتی تمام عمر کنواری رہے
ان کی یہی خودداری تھی جس پر مجھے غصہ تھا۔ غصہ تو مجھے بہت دن رہا مگر میں برابر اسے ٹالا کیا اور کسی عنوان سے اس کا اظہار
نہیں کیا مگر جس طرح بجلی اور گرج کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے اسی طرح غصہ کے ساتھ مذاق بھی میری طبیعت میں
شامل تھا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ غصہ کے وقت میری طبیعت سے مذاق اور شرارت جدا ہو جائے۔ اس خاص معاملہ میں بغیر
کسی خطا کے یا کسی معقول سبب کے بڈھے آدمی کو سزا دینا ناممکن تھا چونکہ مجھے ان پر غصہ تھا اسلئے میں انھیں سزا دینا اپنا کوئی معنی نہ تھے اسی لئے
میں خاموشی سے گزارتا رہا لیکن ایک دن ایسی ایک شرارت میرے ذہن میں آئی کہ اسے عمل میں لانے کو میں کسی طرح نہ روک سکا۔ یہ میں پہلے بھی
بیان کر چکا ہوں کہ کیلاش بابو کے بہت سے دوست انکے سامنے خوشامد کی باتیں کیا کرتے تھے انمیں سے ایک شخص جو سرکاری ملازم تھا جب کیلاش بابو کے
پاس آتے تھے تو اکثر انسے کہا کرتے تھے کہ جب میں چھوٹے لارڈ صاحب کے پاس جاتا ہوں تو وہ نانجور کے بابوؤں کا حال مجھ سے پوچھتے
ہیں۔ اور بارہا میں نے ان کی زبانی یہ الفاظ سنے ہیں کہ بس بنگال میں دو خاندان عزت کے قابل ہیں۔ ایک مہاراجہ برد وان کا خاندان
دوسرا نانجور کے بابوؤں کا۔ جب یہ صریحی جھوٹ کیلاش بابو کے سامنے بیان کیا جاتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے
اور سرکاری ملازم سے ملاقات ہوتی تھی تو وہ باتوں باتوں میں یہ بھی ضرور پوچھ لیتے تھے کہ ہاں یہ تو بتاؤ چھوٹے لارڈ صاحب کیسے
ہیں؟ اچھے ہیں! خیر بہت خوشی ہوئی سنکے۔ اور میم صاحب؟۔ وہ بھی اچھی ہیں؟ اچھا! اور بچے؟ وہ بھی اچھے ہیں؟ بہت۔
جب تم سے ان سے ملاقات ہو تو میری طرف سے بھی سلام کہدینا۔ کیلاش بابو قریب قریب روزانہ اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے
کہ میں چھوٹے لارڈ صاحب سے جاکر کسی روز ملاقات کر آؤں۔ لیکن یہ فرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جب تک نانجور کے بابو کی گاڑی گورنمنٹ
ہاؤس جانے کے لئے تیار ہوگی اس سے قبل نہ معلوم کتنے چھوٹے لارڈ صاحب آکر جا چکے ہوں گے اور گنگا کا بہت سا پانی ہگلی
کے راستہ سے بہہ چکا ہوگا۔۔ ایک روز میں نے کیلاش بابو کو الگ لیجا کر چپکے سے کہا کہ ٹھاکر دادا کل میں ایک جگہ گیا تھا۔ وہاں میں نے
چھوٹے لارڈ صاحب کو نانجور کے بابوؤں کا ذکر کرتے سنا۔ میں نے ان سے کہا کہ کیلاش بابو شہر میں آگئے ہیں یہ سنکر انھیں بے حد
صدمہ ہوا اور انھوں نے کہا کہ شہر میں ہونے کے بعد بھی وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ اور یہ بھی کہا کہ میں قاعدے اور رسم کو ایک
طرف رکھ کے خود ہی کل ان کی ملاقات کو جاؤں گا۔

کیلاش بابو کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو میری چال اور شرارت کو فوراً سمجھ لیتا۔ مگر چونکہ سرکاری ملازم ان سے اکثر یہ ذکر کیا کرتے تھے لہٰذا ان کو لفٹننٹ گورنر کا ملاقات کی غرض سے آجانا خلاف قیاس نہیں معلوم ہوا۔ اور اس وقت میری اس خبر سے وہ بہت گھبرا گئے۔ چھوٹے لارڈ صاحب کی ملاقات کے بارے میں جس امر پر ان کی نظر جاتی تھی اس میں انھیں دقت اور دشواری ہی نظر آتی تھی۔ سب سے بڑی دقت ان کو یہ محسوس ہو رہی تھی کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو پرانی وضع اور قدامت پسندی کا جوہر ہے کہ انگریزی زبان سے ناواقف ہو۔ دوسرے لفٹننٹ گورنر صاحب ہر جگہ اپنے ساتھ ایک ترجمان رکھتے ہیں۔ اور اس ملاقات کو تو انھوں نے صاف صاف کہدیا تھا کہ یہ بالکل نجی اور پرائیویٹ ملاقات ہے۔ اسی روز دوپہر کے بعد ایک دو گھوڑوں کی گاڑی نانیجور کے بابو کے مکان کے سامنے آکے رکی۔ دو چپراسی وردی پہنے ہوئے دروازے پر پہونچے اور پکار کر کہا کہ چھوٹے لارڈ صاحب تشریف لائے ہیں۔ کیلاش بابو تو ان کے منتظر ہی تھے۔ وہ قدیم وضع کے سب سے زیادہ فاخرہ لباس میں، سر پر پگڑی باندھے ہوئے جلدی سے نکلے اپنے ہوئے گاڑی تک آئے اور میرے ایک دوست کو جو انگریزی لباس میں تھا ہر ہر قدم پر سلام کرتے ہوئے اور پچھلے پیروں کھسکتے ہوئے اندر لائے۔ انھوں نے اپنی لکڑی کی کرسی پر باپ دادا کے وقت کی شال ڈال دی تھی۔ اسی پر چھوٹے لارڈ صاحب کو لاکر بٹھایا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں ایک اعلیٰ تقریر کی۔ اور سونے کی کشتی میں چند اشرفیاں رکھکر نذر دیں۔ یہ اشرفیاں اس خاندان کی آخری یادگار تھیں۔ پرانا ملازم گنیش کرسی کے پیچھے کھڑا ہوا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور صاحب کے اوپر برابر گلاب چھڑک رہا تھا۔ کیلاش بابو نے کئی بار اپنی شرمندگی کا اظہار کیا اور کہا میں بہت پشیمان اور خجل ہوں کہ حضور کا استقبال اپنی قدیم خاندانی شان و شوکت کے ساتھ نہیں کر سکا۔ اگر میں نانیجور میں ہوتا تو شاید حضور کا استقبال حضور کے شایان شان طریقے سے کر سکتا مگر یہاں کلکتہ میں میں مسافر ہوں بس یہاں میری یہ حالت ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر زمین پر ڈال دیجئے۔ میرے دوست جو بشپ ہیٹ پہنے ہوئے تھا متانت کے ساتھ سر ہلایا۔ انگریزی تہذیب کے موافق اسے کمرہ میں آنے سے پہلے ٹوپی اتار ڈالنا چاہیے تھی۔ مگر وہ راز فاش ہو جانے کے خوف سے ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ پہچان لیا جاتا اور کیلاش بابو یا گنیش کو اس تہذیب سے واقفیت نہ تھی۔ دس منٹ کی نشست کے بعد میرا دوست رخصت ہونے کے ارادہ سے کھڑا ہو گیا۔ دونوں چپراسیوں نے جیسا کہ انھیں پہلے سے سمجھا دیا گیا تھا اشرفیاں، سونے کی کشتی، شال، چانزو کا گلاب پاش سب لیجا کر احتیاط سے گاڑی میں رکھدیا۔ کیلاش بابو نے اسے چھوٹے لارڈ صاحب کی عادت میں شمار کیا۔

میں یہ سب تماشا دوسرے کمرے سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میری پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا جب میں زیادہ ضبط نہ کر سکا تو دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں پہونچتے ہی جب میں نے ایک نوجوان لڑکی کو اس طرح سسکیاں بھر بھر کے روتے دیکھا تو میرا سینہ شق ہوا جاتا ہے۔ جب اس نے میری ہنسی کی آواز سنی تو نہایت طیش کے عالم میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گلوگیر آواز میں کہا۔ "آخر بتاؤ۔ میرے دادا نے تمھارا کیا نقصان کیا تھا۔ انھوں نے تمھارا کیا قصور کیا تھا۔ تم نے انھیں کیوں دھوکا دیا۔ تم یہاں کیوں آئے۔ تم ....." رنج اور غصہ کے سبب سے کچھ اور اس کی زبان سے نہیں نکل سکا۔ اسے

دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔۔ میری ہنسی دفعتاً تشریف لیگئی۔ میں سمجھتا تھا کہ میری اس شرارت میں مذاق کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اب مجھے نظر آیا کہ ایک نازک اور نرم دل کو میں نے شدید اذیت پہونچائی ہے۔ اب میرے دل نے اس بیرحمی پر مجھے ملامت کرنا شروع کی۔ میں کمرے سے اس طرح چپکا باہر چلا آیا جیسے ٹھکرایا ہوا کتا۔ اتنک میں کسم کیلاش بابو کی پوتی پر اس طرح نظر کرتا تھا جیسے کوئی بالکل بے حقیقت شے کو دیکھتا ہے لیکن اسوقت میں نے دیکھا اور تعجب سے دیکھا کہ اس مکان کے ایک کمرہ کے ایک گوشے میں انسان کا قلب بھی تڑپ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس پر میری شرارت کھل گئی ہے۔

رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ میرے دماغ کی بیچینی کی کوئی حد نہ تھی۔ دوسرے دن سویرے میں تمام سامان لیکر کیلاش بابو کے مکان پر اس ارادے سے گیا کہ چپکے سے سب گنیش کے حوالے کر آؤں گا۔ چنانچہ وہاں جاکر کچھ دیر میں دروازے کے باہر کھڑا رہا مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اوپر کیلاش بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ راستے میں کسم کی آواز میرے کان میں آئی میں کھڑا ہو کر سننے لگا۔ وہ کیلاش بابو سے کہہ رہی تھی "دادا۔ ہم سے بھی بیان کیجئے۔ آپ سے اور چھوٹے لارڈ صاحب سے کل کیا باتیں ہوئی تھیں۔ دیکھئے کوئی حرف چھوڑیئے گا نہیں۔ میں سننے کے لئے بیتاب ہوں" دادا سے اصرار کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فخر و مسرت کی وجہ سے ان کے چہرے پر خون دوڑنے لگا تھا۔ انھوں نے چھوٹے لارڈ صاحب کی تعریفیں کرکر کے سب واقعہ بیان کیا۔ لڑکی بالکل ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اور اتنے غور سے انکے چہرے کو دیکھ رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ کامل توجہ سے سب حال سُن رہی ہے۔ صرف دادا کی محبت میں اس نے سوچا کہ میں اپنے شوق کا اظہار کروں تاکہ ان کے دل کو ملال نہ پہونچے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا قلب پھر تھرا گیا اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں اسی راستے پر خاموش کھڑا رہا۔ ٹھاکر دادا نے چھوٹے لارڈ صاحب کی ملاقات کا کچا چٹھا بیان کیا۔ جب وہ کمرے سے اُٹھکر چلے گئے تو میں نے وہ سامان لیجا کر لڑکی کے پیروں کے پاس رکھدیا اور چپ چاپ باہر چلا آیا۔۔ دوپہر کے بعد میں کیلاش بابو کے پاس گیا۔ ابھی تک میں اپنی نفرت کی وجہ سے اس بڈھے کو سلام نہیں کرتا تھا۔ مگر آج میں نے بہت جھک کر سلام کیا اور ان کے پیر چھوئے۔ میرے خیال میں انھوں نے ضرور یہ خیال کیا ہوگا کہ کل میرے یہاں چھوٹے لارڈ صاحب آئے ہیں اسی لئے یہ لڑکا آج میری تعظیم کر رہا ہے۔ مگر میری تعظیم سے وہ خوش ہوئے اور ایک خاص محبت ان کی آنکھوں میں مجھے نظر آئی۔ ٹھاکر دادا کے اور بھی کئی دوست آگئے اور انھوں نے لفٹنٹ گورنر کی آمد کا واقعہ خوب حاشیے چڑھا کر سب سے بیان کیا۔ وہ اپنے بیان کو اتنا طول دے رہے تھے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ جب سب لوگ انکے پاس سے جا چکے اور میں تنہا رہ گیا تو میں نے انسے بہت منت اور عاجزی سے کہا کہ مجھے امید نہیں ہے کہ میں ایسے مشہور اور نامور خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے کے قابل سمجھا جاؤں گا۔ مگر۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے شادی کی درخواست کو صاف صاف ان پر ظاہر کر دیا تو انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بے اختیار ان کے منھ سے نکل گیا کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور اپنے تئیں یا اپنی بچی کو اتنا خوش نصیب نہیں سمجھتا تھا۔ کیلاش بابو نے اپنی عمر میں اسوقت پہلی مرتبہ اور نیز آخری مرتبہ اپنی زبان سے اپنی غربت کا اقرار کیا اور اپنی عمر میں اسوقت پہلی اور آخری مرتبہ انھیں یہ یاد نہیں رہا (گو وہ ایک لمحہ ہی کے لئے تھا) کہ میں تانجور کے بزرگ اور نامور خاندان سے ہوں۔

سید یوسف حسین زیدی

(نگور)

مسلمان کانگریس، اور مسلم لیگ

جب سے فیض پور کانگریس نے عوام کے ساتھ رابطہ بڑھانے کا اعلان کیا ہے، کانگریس کے رہنماؤں خصوصاً جواہر لال جی اور اُن کے رفیقوں کی طرف سے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم عوام کو کانگریس میں شامل کیا جائے۔ اخباروں میں اس کی تائید میں زوردار مضامین نکل رہے ہیں۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اسکی حمایت میں تقریریں کیجارہی ہیں۔ جواہر لال جی کی طرف سے اس سلسلے میں کئی بیانات شائع ہو چکے ہیں۔ کانگریس نے انتخابات میں کئی مسلمانوں کو کھڑا کیا اگرچہ ان میں سے اکثر ناکامیاب رہے۔ جھانسی کے مسلم حلقے کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار کے خلاف کانگریس نے اپنا امیدوار نثار احمد خانصاحب شروانی کو بنایا، اور ان کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کیا۔ کانگریس کے بڑے بڑے رہنما، مثلاً جواہر لال نہرو، پنڈت گوبند ولبھ پنت، خان عبدالغفار خان، مولانا حسین احمد، اچاریہ نریندر دیو، مسٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمود اور بہت سے دوسرے رہنماؤں نے اس حلقے میں پہونچکر رائے دہندگان کو نثار احمد خانصاحب کے حق میں رائے دینے کی ترغیب دی۔ کانگریس نے اپنی بڑی قوت کو اس محاذ پر جمع کیا اور مسلم عوام کے اس فیصلہ کو تمام ہندوستان نے نہایت بے صبری سے انتظار کیا۔ لیکن مسلمانوں کا فیصلہ کانگریس کے امیدوار کے خلاف ہوا اور لیگ کے امیدوار مسٹر فیدالدین منتخب ہوگئے۔

سوال محض ایک نشست یا چند نشستوں کا نہیں تھا بلکہ اصولی اور بنیادی سوال تھا۔ اب تک جتنے انتخاب ہوئے ہیں وہ جداگانہ حلقوں سے ہوئے ہیں۔ یہ ہیں مسلم حلقے مسلمانوں کے لئے محفوظ رہے ہیں، اور ہندو حلقے ہندوؤں کے لئے۔ ہر فرقے نے اپنے حلقے کے کام کو ایک نجی اور ذاتی معاملہ سمجھا ہے، جس میں دوسرے فرقے کے لوگوں نے کبھی مداخلت نہیں کی چنانچہ مسلمان حلقوں میں اب تک صرف مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ہی کام کرتی تھیں۔ اور اپنے فرقے میں جن افراد یا جماعتوں کو زیادہ طاقت حاصل ہوتی تھی اُن کے امیدوار منتخب ہوا کرتے تھے لیکن کانگریس اب ایک نئی روایت قایم کررہی ہے۔ کانگریس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے وہ پابندیاں جو فرقہ وار جماعتوں پر عاید ہوتی ہیں۔ اس پر عاید نہیں کی جاسکتیں اسے مسلمان حلقے میں کام کرنے کا ایسا ہی حق حاصل ہے، جیسا اُسے ہندو حلقے میں ہے۔ کانگریس کے ہندو کام کرنے والے اپنے سیاسی و معاشی پروگرام کے نام پر مسلمانوں میں اسی طرح کام کرسکتے ہیں، جیسے اس کے مسلمان کام کرنے والے ہندوؤں میں کرسکتے ہیں۔ کانگریس مذہب کے نام پر رائے حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ وہ ایک سیاسی جماعت ہے۔ اس لئے اپنے سیاسی و

معاشی پروگرام پر ووٹ حاصل کرتی ہے۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ رائے دہندہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر وہ اس کے پروگرام سے متفق ہے۔ تو اسے اُس کے امیدوار کو ووٹ دینا چاہئے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بلاشبہ دستور میں موجود ہیں۔ انتخاب مسلمانوں کی رائے سے مسلمان امیدواروں کا ہی ہوگا۔ کانگریس کے نزدیک یہ باتیں بجائے خود ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن دستور دوسروں کا بنایا ہوا ہے اور انتخاب میں حصہ لینے کا کانگریس فیصلہ کر چکی ہے۔ اس لئے ان خرابیوں کو تو اسے فی الحال گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ مگر قانون کے اندر رہ کر اس میں جو کچھ اصلاح کی جا سکتی ہے وہ تو کرنا ہی چاہئے۔ مثلاً ووٹروں کو مشورہ دینے اور اپنے مسلم امیدوار کیلئے کوشش کرنے سے ہندوؤں کو قانون منع نہیں کرتا۔ پھر جب یہ کوشش ہندو مذہب کا نام لیکر نہ کی جائے، بلکہ سیاسی اور معاشی پروگرام کو نمایاں کر کے، اور کانگریس کے مسلم رہنماؤں اور مسلم اراکین کے پورے اشتراک عمل کے ساتھ کی جائے تو دنیا کی نگاہ میں اس میں کوئی مذموم اور معیوب پہلو باقی نہیں رہتا۔ یہ تو ہوئی کانگریس کی پوزیشن۔

لیکن مسلم لیگ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو یہ بات ناپسند ہے۔ وہ مسلمان کی سیاست میں کانگریس کی مداخلت گوارا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے نمائندے کو منتخب کرنا مسلمانوں کا نجی معاملہ ہے۔ کانگریس اُن کے نزدیک ایک غیر مسلم جماعت ہے اس لئے کانگریس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنظیم، قوت، روپیہ، قابلیت، پریس اور اکثریت سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کے انتخابات پر ناجائز اثر ڈالے۔ اُسے مسلمانوں سے کوئی ربط و تعلق براہ راست نہ پیدا کرنا چاہئے، بلکہ اسے مسلمانوں کی مسلمہ سیاسی جماعتوں اور اُن کے رہنماؤں سے معاملہ کرنا چاہئے۔ درحقیقت یہی لوگ سمجھوتہ اور صلح کرنے کے اہل ہیں، کیونکہ یہ مساوی سطح پر رہ کر اور مسلمانوں کے مفاد کو پوری طرح سوچ سمجھ کر معاملہ کر سکتے ہیں۔ کانگریس کو ایسے لوگوں کی سرپرستی اور اُن سے معاملہ اور سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے جنہیں مسلمانوں کی جماعت میں کوئی اعتبار و اعتماد، عزت اور وقعت حاصل نہیں ہے اور جو محض اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ جماعت کے نمائندہ بن کر نہیں کر سکتے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ایسے افراد کو کبھی بھی مسلمانوں کا نمائندے نہیں کہے جا سکتے اور جب مسلمانوں کے صحیح نمائندوں کو نظر انداز کر کے، ایسے لوگوں کو وزارتوں میں شامل کیا جاتا ہے، اور ان سے مسلمانوں کے مسایل کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے اور ان کی رائے کو مسلم جماعت کی رائے تسلیم کیا جاتا ہے، تو گویا دنیا کو دھوکا اور فریب دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں سے من حیث الجماعت سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ چالاکی اور عیاری اور زور اور زبردستی سے انھیں اپنی بات تسلیم کرنے کے لئے مجبور کر رہی ہے۔ جو تحفظات مسلمانوں کو دستور میں دیئے گئے ہیں انھیں وہ دراصل ختم کرنا چاہتی ہے اور مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم و کرم کا پابند بنانا چاہتی ہے۔

جواہر لال جی اور ان کے کانگریسی رفقاء اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں خصوصاً مسلم لیگ اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کو مسلم عوام کا صحیح نمائندہ تسلیم نہیں کرتے۔ وہ انھیں رجعت پسندی اور سرکار پرستی کا الزام دیتے ہیں اور زمینداروں، تعلقہ داروں، خطاب یافتوں اور سرکاری ملازموں کا آلہ کار سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح مسلمانوں کو بھی انفرادی حیثیت کے ساتھ کانگریس میں شریک کرنا چاہتے

ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ اس بنیاد پر کسی قسم کی جداگانہ جماعت بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فایدہ کے لئے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجایز فایدہ اُٹھا کر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ اس فریب کو جسقدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہیئے اور عوام کے سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہیئے۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ انکے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں ان اہم مسئلوں کو تو فراموش کر دیتی ہیں۔ البتہ مذہب، تمدن اور زبان کی حفاظت کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتی ہیں۔ "پراگندہ روزی پراگندہ دل" جس غریب کی زندگی کا ہی کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ زبان و تمدن سے اپنی آتما کی آگ کو کیسے ٹھنڈا کر سکتا ہے — اس کے برخلاف کانگریس اس تباہ حالی کے اسباب بتلاتی ہے اور ان کے رفع کرنے کی تدبیریں پیش کرتی ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ ہندوستان کی ساری مصیبتوں کا سرچشمہ برطانوی سامراج ہے جب تک یہ آکاش بیل موجود ہے ہندوستان کا کوئی پودا سرسبز نہیں ہو سکتا۔ مذہب تمدن اور زبان کی حفاظت اسی وقت کی جا سکتی ہے جب فراغت اور جمعیت خاطر ہو۔ جب تک یہ مفقود ہیں سب کام کمزور اور بے نتیجہ رہیں گے۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مذہب تمدن اور زبان کی ترقی میں بھی سب سے بڑی رخنہ اندازی غیر ملکی حکومت کی طرف سے ہو رہی ہے جو کسی فرقے کو پنپنے نہیں دیتی۔ اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس مشترک مصیبت سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کی جائے۔ ملکی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا اولین فرض ہے ملک میں فی الحال دو سیاسی قومیں برسرپیکار ہیں۔ ایک قوم پرست اور دوسری سرکار پرست۔ ان کے علاوہ کوئی تیسری قوت نہیں ہے چھوٹی چھوٹی کم زور جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ افراد کے غیر متحد اور منتشر گروہ ہو سکتے ہیں۔ جاہ پرست اور خود غرض اشخاص اور اُنکے حامیوں کا غول ہو سکتا ہے تمدن و مذہب کی حفاظت کے لئے ادارے ہو سکتے ہیں۔ لیکن جاندار اور طاقت ور واضح اور متعین سیاسی نصب العین رکھنے والی جماعتیں فی الحال صرف دو ہیں — کانگریس اور برطانوی سامراج۔ اس لئے فی الحال کسی تیسری سیاسی جماعت کے قایم کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اسوقت سیاست میں شرکت کے معنی عملاً دو ہی ہو سکتے ہیں یا کانگریس کا ساتھ دیا جائے یا حکومت کا یا پھر بے عملی اور کم ہمتی کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی کا ساتھ نہ دیا جائے، اور بیٹھ کر تماشا دیکھا جائے۔ مسلمانوں کی باعمل سیاسی جماعتیں یا تو ملک کی آزادی کی حامی ہو سکتی ہیں، یا برطانوی سامراج کی پہلی صورت میں ان کے اور کانگریس کے اور دوسری صورت میں ان کے اور حکومت کے نصب العین میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس پوزیشن کو اگر تسلیم نہ بھی کیا جائے اور کہا جائے کہ نہیں ملک میں اور دوسری سیاسی جماعتیں بھی ہو سکتی ہیں تب بھی مذہب کو سیاسی معاملات سے علٰحدہ رکھنا ہی مناسب ہے۔ مذہب اور سیاست کا اشتراک سائنتی (فیوڈل) اور متوسط عہد کی یادگار ہے۔ یہ نصب العین موجودہ عہد میں اور کم از کم ہندوستان میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے آباد ہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کا کوئی سیاسی نصب العین کانگریس کے نصب العین سے جدا ہے، تو اسے اپنے ہم مشرب اور ہم خیال لوگ ہندوؤں میں بھی بلاشبہ مل سکتے ہیں، اور اسے ان لوگوں کو اپنے درمیان ضرور

شامل کرنا چاہئے۔ اور اپنی سیاسی قوت کو اس طرح بڑھانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ سیاسی نصب العین کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندو مہاسبھا یا لبرل لیگ اور مسلم لیگ کے نصب العین میں کوئی فرق نہ ہو۔ لہٰذا سیاسی معاملات میں ان جماعتوں کو باہم متحد ہو جانا چاہئے رہے مذہبی اور تمدنی معاملات سو اگر کچھ ایسے معاملات ہیں جن کا تحفظ کانگریس کے بنیادی حقوق کے رزولیوشن سے نہیں ہوتا تو اُن کے تحفظ کی کوشش کو مذہبی اور تمدنی جماعتوں اور اداروں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے جو زیادہ موثر اور معقول طریقے پر اپنے حقوق کی پیروی خود کر سکتی ہیں۔

لیکن جو مسلمان مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعت بندی کے قایل ہیں وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ عوام بھوکے اور ننگے ہیں ملک میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی انھیں مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے وہ نہ صرف مذہب بلکہ مذہبی توہمات کے لئے پروانوں کی طرح جانیں نثار کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی جزئی تفصیلات پر مذہب کا رنگ پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے کانگریس کو اسے مذہبی رنگ دینا پڑا۔ اور سیاست پر مذہب کے اس اثر نے مذہبی احساس کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ سیاسی آزادی کو مذہبی آزادی کے روپ میں پیش کیا جانے لگا اور ہندو اور مسلمان اس کا مفہوم اپنے تمدن و مذہب کی ترقی اور احیاء اور اپنے فرقے کا اقتدار سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ تاریخی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں پر حکومت کر چکے ہیں اور تاریخ کو جس رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں ہندوؤں کو کافی ذلیل و خوار کیا (محکومیت خود ایک ذلت ہے) اس لئے مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دلوں میں طالب علمی کے زمانہ سے ایک دلی نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ انگریزوں کی طرح مسلمانوں کو بھی غیر ملکی فاتح سمجھتے ہیں، اور دونوں کے ناپاک اثر سے ملک کو آزاد کرنا چاہتے ہیں، اور مسلمان اس کے برعکس اس زعم میں کہ جب ایک دفعہ حکومت کی ہے تو دوبارہ بھی کی جا سکتی ہے، مسلم راج کے خواب دیکھتے ہیں، لیکن خود چونکہ اکثر صوبوں میں اقلیت میں ہیں، اور جاہل اور نادار ہیں، اس لئے بیرونی امداد پر نظر رکھتے ہیں کہ افغان یا ترک بلکہ فلسطین اور شام و مصر کے عرب ہندوستان میں مسلم راج قائم کریں گے۔ اور جب تک وہ نہیں آتے برطانیہ سے اپنے حقوق کا تحفظ کرانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہندو فرقہ پرست غیر ملکی حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے جب تک ان میں پوری طاقت نہ آجائے مکمل آزادی لینا نہیں چاہتے بلکہ برطانیہ سے تعلق باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

جس ملک میں مذہبی احساس قوی ہو اور رواداری مفقود ہو وہاں مذہب کی اس رقابت اور تعصب کا اثر سیاسی اور معاشی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اقلیت کے محض تمدنی و مذہبی اور لسانی حقوق کا تحفظ کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کو سیاسی اور معاشی تحفظات کی بھی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہندوستان میں آئے دن ہندو مسلم فساد ہوتے رہتے ہیں اور ایک ہی ملک کے دو رہنے والے جس بے رحمی اور درندگی کے ساتھ اپنے پڑوسیوں کا خون محض مذہب کے اختلاف کی وجہ سے بہاتے ہیں اور جس طرح بعد میں انصاف اور حب الوطنی کو بالائے طاق رکھ کر مذہبی جانب داریوں سے کام لیتے ہیں وہ ہر شخص کو معلوم ہے اسوقت تو

ایک بیرونی طاقت موجود ہے جو ملکی فریقین کو حدود سے متجاوز نہیں ہونے دیتی اور ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتی ہے لیکن جب فریقین میں سے خود ایک فریق کا عدالت کی کرسی پر قبضہ ہوگا اس وقت وہ کہاں تک اپنے مذہبی تعصب کو دبا سکے گا یہ مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں گزشتہ تجربے سے کوئی امید افزا رہنمائی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کو ہندو حاکمانِ عدالت اور سرکاری عہدہ داروں، دفتر کے محرروں بلکہ ڈاکخانہ اور ریلوے کے ملازموں، اخباروں اور رہنماؤں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ جب کبھی ہندو مسلم سوال پیدا ہوتا ہے، وہ فرقہ پروری سے کام لیتے ہیں اور مسلمانوں کو ملزم ثابت کرنے اور انھیں نقصان پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ملک میں ایسی انجمنیں بھی موجود ہیں اور اُن کا اثر تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے اور ان کے رکن ملک کے نہایت معزز اور با اقتدار تعلیم یافتہ اور دولتمند لوگ ہیں جو علی الاعلان اپنا مقصد یہ بیان کرتی ہیں کہ مسلمانوں کا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیا جائے۔ مہاسبھا کی تحریک موجود ہے۔ ہندی تحریک جاری ہے۔ خود کانگریس میں فرقہ پرست ہندو موجود ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے شہری حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور ضمانت چاہتے ہیں۔

محض لوگوں کے چیخ چیخ کر یہ کہنے سے کہ مذہب کی اہمیت کا زمانہ ختم ہو گیا اس بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عملاً اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ روزمرہ کی عملی زندگی کے فیصلے بے سروپا اور خیالی باتوں سے نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ان سے تسلی اور تسکین نہیں ہو سکتی آپ کا یہ کہنا کہ صرف روٹی کا سوال اہم ہونا چاہئے کافی نہیں ہے کیونکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ لوگ پیٹ سے زیادہ اہم مذہبی باتوں کو سمجھتے ہیں اور اس کے لئے اپنا جان و مال ہر وقت نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مسجدوں، مندروں، دریاؤں کے گھاٹوں، یا تراؤں اور اشنان کے میلوں میں کروڑوں آدمی روز مذہبی عقیدت کے ساتھ جاتے آتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی سی چھوٹی بات میں مذہب کا اثر نمایاں ہے۔ انتخابات میں مذہب کا اثر نمایاں ہے۔ انتخابات میں جو مذہب کے نام پر جو امیدوار کھڑے کئے گئے وہ کامیاب ہوئے اور سیاسی و معاشی پروگرام پیش کرنے والے امیدوار ناکام رہے۔ اس لئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کا زمانہ ختم ہو گیا۔ حقایق کو سامنے رکھ کر معاملات کا فیصلہ کیجئے۔ محض خیال پرستی اور مستقبل کے امکانات پر لوگوں کو اپنے جایز حقوق قربان کرنے کے لئے آمادہ نہ کیجئے کیونکہ اگر آپ ایسا کریں گے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ دوستی کے پردے میں دشمنی کر رہے ہیں۔

غرض کہ مسٹر جناح اور اُن کے طرفداروں، اور پنڈت جواہر لال اور کانگریسیوں کی طرف سے اس قسم کے مباحثے کا ایک سلسلہ لامتناہی جاری ہے۔ میں نے مسئلے کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے ذرا تفصیل کے ساتھ فریقین کی آراء اور افکار کو بیان کیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں اس مسئلے پر اپنی رائے کا بھی اظہار کر دوں

میں مسئلے کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں الجھنا نہیں چاہتا نہ غیر متعلق بحثوں میں پڑنا چاہتا ہوں میں عملی پہلو سے مسئلے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ جب ہر چہار طرف ہماہمی، زندگی اور حرکت کا دور دورہ ہو، مسلمان جمود کی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ رہنا بھی چاہیں تو تغیر حالات اور واقعات انھیں حرکت کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ انھیں ذاتی مدافعت اور تحفظ کے لئے حرکت کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ تعطل اور جمود کے معنی بربادی اور موت کے ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان تین کام

کر سکتے ہیں۔ یا تو جو قوتیں یورش کر رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شامل ہو کر آگے بڑھیں۔ یا اپنے لئے ایک نئی راہ نکالیں اور دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کر کے آگے بڑھیں، یا اپنی موجودہ جگہ پر ایک چٹان یا آہنی دیوار کی طرح مضبوطی کے ساتھ کھڑے رہیں اور تمام مخالف قوتوں کا تنِ تنہا مقابلہ کرتے رہیں کہ پھر ان کے اس طرح پڑے رہنے کو لوگ جمود اور تعطل نہیں کہیں گے بلکہ واقعی اقدام و حرکت سے تعبیر کریں گے۔ بہرحال یہ تین راہیں ہیں ـــــ تیسری راہ کو میں سب سے پہلے لیتا ہوں۔ کیونکہ اس کے متعلق مجھے سب سے کم کہنا ہے۔ اس راہ کو وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو اپنے موجودہ املاک اور مقبوضات کا تحفظ ضروری سمجھتے ہوں۔ سو موجودہ نظم اور انتظام میں مسلمانوں کو من حیث الجماعت کچھ ایسے امتیازی حقوق حاصل نہیں ہیں کہ جن کے پامال ہو جانے کا نئے انتظام میں اندیشہ ہو۔ چند زمیندار اور وہ مقروض، چند تاجر جن کی حالت کچھ مضبوط نہیں، اور چند حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار جو اپنی پوری تنخواہ مہینے کے پہلے ہفتے میں بلوں کی ادائیگی پر صرف کر دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بقیہ بل کس طرح ادا کریں ـــــ یہ مسلمانوں کے طبقۂ امرار کی کل کائنات ہے۔ باقی سب جمہور ہیں ان کی حالت کو کوئی بھی نیا انتظام موجودہ حالت سے پست تر نہیں کر سکتا۔ ان کا سب سے زبردست مال و متاع ان کی وہ زنجیریں ہیں جو انھیں پابند کئے ہوئے ہیں۔ انھیں کو ان سے چھینا جا سکتا ہے۔ ان کے پاس دوسری اور کوئی چیز ضایع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے تبدیلی اور حرکت کا اُن سے زیادہ کون خواہاں ہو سکتا ہے۔ ان کا قیام اور عدم حرکت کسی لالچ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ خاص کاہلی، کم ہمتی اور بزدلی کی وجہ سے ہے۔ کاہلی دور کیجئے جوش دلائیے یہ ضرور آگے بڑھیں گے۔

اس بات سے برطانوی مدبر اور سیاست داں بہت چراغ پا ہوں گے۔ سر آغا خاں کو بھی غالباً غصہ آئے گا کہ نصف صدی کی پیہم اور مسلسل کوشش کا یہ نتیجہ نکلا! بات دراصل یہ ہے کہ یا تو بیج شورزمین میں ڈالا گیا، یا بیج بونے والوں نے مٹرا ہوا بیج بویا۔ بہرحال سبب جو کچھ بھی ہو نتیجہ یہی برآمد ہوا ہے۔ ایم، اے او کالج، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، اصلاح تمدن و معاشرت کی کانفرنس، ہر ضلع میں مسلم ہائی اسکول آل انڈیا مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی، تنظیم کانفرنس، تبلیغ کانفرنس، آل انڈیا مسلم کانفرنس۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب، ملازمتوں میں نمایندگی کا تحفظ، مخصوص نامزدگیاں، وزارت میں تناسب سے زیادہ شرکت، سیکڑوں ہندو مسلم فسادات، کمیونل اوارڈ اور ہزاروں اور چھوٹی چھوٹی رعایتیں ـــــ سب کا ماحصل یہی ہے اور مسلمانوں کے لئے جیسے ۱۹۰۵ء میں غیر مطمئن یا مطمئن ہونے کا موقع تھا ایسا ہی ۱۹۳۷ء میں بھی ہے۔ ان کے لئے ان تمام مقویات میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی قلب ماہیت ان چیزوں میں سے کسی سے نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اپنی سخت جانی کی وجہ سے تو بیشک انھیں کنزرویٹو پارٹی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے پاس کنزرو کرنے یعنی محفوظ رکھنے کے لئے درحقیقت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ان کی اکثریت تو ہمیشہ کی انقلابی ہے، اور اب بھی جب کبھی موقع ملے گا انقلابی ہی بن سکے گی ورنہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو بیٹھی ہی ہے۔ اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ یہ ہمیشہ اپنی موجودہ جگہ پر چٹان اور پہاڑ کی طرح کھڑے رہنا پسند کریں گے فضول ہے۔

اب رہ گئے دو باقی ماندہ راستے۔ ان میں سے دوسرے راستے یعنی اپنے لئے ایک نئی راہ نکالنے اور دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے ایک عرصہ سے کوششیں جاری ہیں۔ سید جمال الدین افغانی نے اتحادِ اسلامی کی تحریک اٹھائی مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، غرضکہ ۱۹۲۰ء کے تقریباً تمام ہی مسلمان لیڈروں نے خلافت اور اتحاد اسلامی کی راہ کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ مسلمان عوام نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان تحریکوں کا خیر مقدم کیا۔ اور اپنی بساط کے مطابق ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیاں ان کے لئے کیں۔ ترکی کو میڈیکل مشن بھیجے۔ خلافت کی تحریک میں شورش و ہنگامہ برپا کر کے انگریزوں کو پریشان کیا۔ ملک سے ہجرت کی۔ موپلاؤں کی بغاوت ہوئی غرضکہ خوب جوش و خروش دکھلایا گیا۔ لیکن ہندوستان کی سیاست میں کس طرح حصہ لیا جائے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کس قسم کے تعلقات کو روا رکھا جائے، اس کا تعین نہ ہو سکا۔ خلافت کے مسئلے پر ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔ اخباروں کے کالم، رسالوں کے صفحات اور لوگوں کے دماغ اس لٹریچر سے معمور کر دئے گئے۔ لیکن برادرانِ وطن جس چیز کے لئے شورش کر رہے تھے یعنی سوراج اس سے عامۃ المسلمین کو واقف کرنے اور دلچسپی پیدا کرانے کی زحمت بہت کم لوگوں نے گوارا کی۔ اسی لئے ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کی جو پوزیشن ہونی چاہئے وہ کسی پر پوری طرح واضح نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۹ء کے ریفارم ایکٹ پر ملک میں عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کی تحریک خالص سیاسی آزادی کی تحریک تھی۔ لیکن ہماری تحریک قیام خلافت اور آزادی جزیرۃ العرب کے لئے تھی۔ گویا تقسیم عمل یہ کی گئی تھی کہ سوراج ہندو لے لیں اور ہمیں ترکی کا خلیفہ مل جائے اور ہمارے مقامات مقدسہ عربوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ یہ ہو جائے تو پھر مسلمان مطمئن ہیں اور انھیں کچھ اور نہیں چاہئے۔ شاعر نے اس شعر میں ؎

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آن من
از سقف خانہ تا بہ ثریا از آن تو

جب حصہ تقسیم کیا تھا تو خاکساری سے کام لیتے ہوئے اپنے لئے صرف گھریلو چیزیں رکھی تھیں اور پوری فیاضی کے ساتھ باقی تمام چیزوں کو اپنے شریک کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم نے اس کے بالکل برعکس کیا ہم نے آسمان کی سب چیزیں تو خود لے لیں اور زمین کی چیزوں کو اپنے برادرانِ وطن کے لئے چھوڑ دیا ؎

آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما!

آج کل بھی مسلمانوں میں شورشیں ہوتی ہیں تو مسجد شہید گنج کے لئے جلسے کئے جاتے ہیں تو قادیانیوں کے خلاف اور مدح صحابہ کی تائید میں۔ پھر یہ ہنگامے بھی وقتی اور موسمی ہوتے ہیں۔ پھلجھڑی کی طرح کچھ دیر بہار دکھا کر ختم ہو جاتے ہیں اور اپنا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑ جاتے۔ کوئی واضح سیاسی نصب العین متعین ہونے نہیں پاتا، کوئی منظم مستقل اور مضبوط جماعت یا ادارہ نہیں بنتا۔ مسلمانوں کے افراد جیسے پہلے منتشر تھے ویسے ہی بعد میں بھی رہتے ہیں۔ اور ان تحریکات کے ردِ عمل سے لوگوں میں ایک مایوس کن بے حسی لاپروائی اور غیر ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔

اسوقت لے دے کر مسلمانوں کا اگر کوئی واقعی سیاسی ادارہ ہے تو وہ مسلم لیگ ہے لیکن اس کی تنظیم جس قدر ناقص، اس کی لیڈر شپ جس قدر بودی اور پسپسی، اس کا نصب العین جس قدر کو را اس کے عناصر جس قدر غیر ہم آہنگ، اس کی کیفیت اور حلقۂ اثر جس قدر محدود اور غیر یقینی، اس کی آواز جس قدر کمزور اور اس کی جد و جہد جس قدر بے اثر ہے وہ شاید آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے لئے بھی باعثِ شرم ہوگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری قوتوں کو اپنے اندر جذب کرنا تو کجا خود اپنے عناصر کو باہم متحد نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے ایک طاقتور قوت بن کر اپنے واسطے ایک الگ سیاسی راہ نکالنے سے بالکل قاصر ہیں۔ یہ بات تلخ ہے، ناگوار معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بہر حال حقیقت۔ اس وقت ضرورت حقیقتوں کو سامنے رکھنے کی ہے۔ ہم نے خیال پرستیوں میں بہت زمانہ گزار دیا۔ اب بھی موقع ہے کہ سنبھل جائیں اور بے نتیجہ کاموں میں اپنی قوتوں کو ضایع نکریں۔

اس راہ سے بھی مایوس ہونے کے بعد اب تیسری راہ یہ رہ جاتی ہے کہ ملک میں جو قوتیں ترقی پا رہی ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ متحدہ طور پر یا مختلف قوتوں کے ساتھ فرداً فرداً شرکت کی جائے یہ ظاہر ہے کہ سیاسی فرقہ بندیوں کا جو موجودہ انداز ہے اس کے پیش نظر مسلمان من حیث الملت کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ ان میں سے جو سوشلسٹ خیال کے ہیں وہ سوشلسٹ کے ساتھ ملیں گے اور جو کنزرویٹو یا برطانیہ پرست ہیں وہ کنزرویٹو جماعت اور برطانیہ کے شریک ہوں گے۔ یہ ناگزیر ہے۔ موجودہ صورتِ حالات میں اس رجحان کو کوئی قوت نہیں بدل سکتی۔ سیاسی معاملات میں مسلمانوں میں افتراق اور انتشار ضرور ہوگا، چنانچہ یہ نہایت تیزی سے شروع بھی ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ انفرادی حیثیت سے کانگریس میں شرکت کر رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی اگر ان کو سیاست سے علٰحدہ رکھا جائے یہی انتشار ظاہر ہو۔ سیاسی حیثیت سے مختلف الخیال مسلمان مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے تحفظ کے لئے باہم مشترک ہو سکتے ہیں اور اگر خالص تمدنی اور مذہبی اداروں کو غیر سیاسی اصولوں پر چلایا جائے تو یہ چل بھی سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے کچھ ادارے مسلمانوں میں موجود ہیں جن کے ساتھ سب کو ہمدردی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان سنجیدگی سے اس بات کی خواہش کریں تو ملک کے ہر صوبے ضلع اور دیہات میں اس قسم کے اور بہت سے اداروں کی گنجائش نکل سکتی ہے اور ان کی موجودگی میں مسلمانوں کے تمدن مذہب اور زبان کی پوری حفاظت ہو سکتی ہے۔

اب رہا اس بات کا اندیشہ کہ چونکہ ہندو اکثریت میں ہیں اور چونکہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات ایک عرصے سے نہایت ناخوشگوار چلے آرہے ہیں اس لئے ہندوؤں کو حکومت کا اقتدار ملنے کے بعد اس بات کا پورا موقع مل جائے گا کہ مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور زبان کو فنا کر دیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور جب تک ڈیماکریسی کا کام اکثریت کے فیصلے سے ہوتا ہے وہ موقع تو انھیں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے بعد بھی ایسا ہی حاصل رہے گا، جیسا کہ ان کی جداگانہ سیاسی جماعت بندی نہ ہونے کی حالت میں ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بہر حال جداگانہ جماعت بندی کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی جتنی پہلے تھی۔

رہا سوال مناسب احتجاج کا تو وہ جداگانہ تمدنی تنظیم کے ذریعے بھی اتنے ہی شد و مد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جتنا جداگانہ سیاسی جماعت بندی کے ذریعے۔ بلکہ میرے خیال میں تمدنی تنظیم کا اثر زیادہ وسیع اور اس میں سیاسی پیچیدگیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی کا امکان نسبتاً کم، اور وسیع المشرب ہندوؤں کی ہمدردی حاصل کرنے کا امکان نسبتاً زیادہ ہوگا جب مسلمانوں کے دوسرے مذہب والوں سے سیاسی تعلقات خوش گوار ہوں گے تو وہ تمدنی اور مذہبی معاملات میں بھی اُن سے تعلقات بگاڑنا نہ چاہیں گے۔ اور رواداری سے کام کریں گے۔ چنانچہ جن جن غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں میں مسلمان شامل ہیں اور اپنا کام وہاں خلوص اور دیانت سے انجام دیتے ہیں ان میں ان کے جذبات کا پورا احترام کیا جاتا ہے تعصب کی جتنی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہ ان ہی جگہوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں جہاں سرکار برطانیہ کا اقتدار غالب ہے۔ قومی حلقوں میں یہ وبا بہت کم ہے اور جتنی زیادہ تعداد میں مسلمان ان میں شرکت کریں گے اور ان کی آواز وہاں اہمیت حاصل کرتی جائے گی، اتنی ہی ان کی پاسداری زیادہ کی جائے گی۔ چنانچہ اُردو ہندی کے مسئلہ پر مہاتما گاندھی کے تازہ ترین بیانات اُن کے پچھلے بیانوں کے مقابلہ میں زیادہ رواداری پر مبنی معلوم ہوتے ہیں اسی قسم کی اور صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

نتیجہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہیں کرنا چاہئے! البتہ مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے اپنی تنظیم ضرور کرنا چاہیے۔ (جامعہ)

آئندہ جنوری ۳۸ء کا "نگار"

دوچند ضخامت کے ساتھ صرف ایک موضوع پر شایع ہوگا

اور موضوع بھی وہ جو نہایت اہم ہے — یعنی — اسلامی ہند کی تاریخ

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تاریخ تین یا چار قسطوں میں مکمل ہو جائے گی اور اسکی پہلی قسط جنوری ۳۸ء کے نگار میں شایع ہوگی "اسلامی ہند کی تاریخ" بالکل جدید اصول پر نہایت کاوش و تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ اس میں تمام تاریخی ماخذوں سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان مقامات کی جغرافی تحقیق بھی اس میں پائی جاتی ہے جن کا نام تاریخوں میں نظر آتا ہے لیکن ان کی تعیین بہت کم کی گئی ہے۔

"اڈیٹر نگار کا بے مثل تاریخی کارنامہ"

اگر دیکھنا ہو تو جنوری ۳۸ء کا "نگار" ضرور حاصل کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب میں بھی اس کے خریدار پیدا کیجئے۔ قیمت فی کاپی دو روپیہ نگار کے سالانہ خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں ملیگا۔ شش ماہی خریدار اس رعایت سے فایدہ نہ اٹھا سکیں گے

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

معصیت اور مذہب و عقل

(جناب غلام محمد خانصاحب مچھرالہ)

آپ کا رسالہ نگار یہاں باقاعدہ آتا ہے اور نہایت شوق سے اور پوری توجہ سے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ناظرین کے دل میں یہاں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ خفیہ بدیوں سے انسان کیسے بچ سکتا ہے اگر بہشت کی طمع اور دوزخ کا خوف نہ ہو؟۔

شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں کو جب خدائی بہشت اور دوزخ پر ایمان پیدا ہو گیا تو پھر انھوں نے خلوت اور تنہائی کی بدیوں اور پوشیدہ بدیوں کے ارتکاب کا خیال تک بھی ترک کر دیا۔ آپ اسبارہ میں بذریعہ نگار روشنی ڈالیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خدا کی ہستی کے اقرار کے بغیر خفیہ اور تنہائی کے حالات میں قلب پر حکومت کرنے والی دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ مجرد عقل تو بعض حالات میں خونریزی قتل جھوٹ میں کامیابی دیکھ کر ناجائز فعل کر لینے سے نہیں روک سکتی اسبارہ میں مہربانی کر کے بذریعہ نگار اپنے خیالات عالیہ سے بہت جلد مستفید فرماویں۔ شیطان ابلیس ارواح خبیثہ کی ہستی کو قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے اور ارواح طیبہ کو بھی۔ کیا قرآن کریم کی تعلیم نہیں کہ جن آگ سے پیدا ہوئے ہیں اور پوشیدہ ہیں اور انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور دکھائی دینے والا ہے۔ آپ کا علم اس بارہ میں کیا ہے؟ قربانی کو آسمان سے آگ اتر کر کھا جاتی تھی کیا یہ قرآن شریف نے صحیح تسلیم نہیں کیا، کیا یہ سب جاہلیت کے زمانہ کے مسلمات ہیں؟

(نگار) آپ کا استفسار متعدد مباحث چاہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصل مقصود آپ کا یہ ظاہر کرنا ہے کہ پوشیدہ گناہوں سے احتراز کرنے کے لئے بہشت و دوزخ اور وجود باری کا عقیدہ ضروری ہے، اور اس کے ثبوت میں آپ نے ابتداء اسلام کے عربوں کو پیش کیا ہے۔ مجھے اس کے جواب میں آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا ان مذاہب و اقوام میں (مثلاً

اسلام و پیروانِ اسلام ہی کو لے لیجئے) جو آپ کے نقطۂ نظر سے وجودِ باری کے بھی قایل تھے اور مرنے کے بعد فردوس، جہنم سے واسطہ پڑنے کو بھی ضروری خیال کرتے تھے، معصیت کرنے والے نہ پائے جاتے تھے، کیا وہ سب معصوم تھے۔ آپ خیال کی معصیت کو کہتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسلمان ہونے کے بعد، وجودِ باری پر یقین رکھنے اور بہشت و دوزخ کے قایل ہونے کے باوصف وہ علانیہ معصیت سے بھی باز نہ آتے تھے، پوشیدہ گناہوں کا کیا ذکر ہے۔ خیر اس عہد کو چھوڑئے خود رسول اللہ اور عہد خلفاء راشدین کو لے لیجئے اور تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے شراب بھی پی، زنا بھی کیا، قتل و غارتگری بھی کی۔ چوری سے بھی باز نہ آئے اور مکر و فریب سے بھی ضرورت کے وقت کام لیا۔ الغرض وہ کونسی ایسی معصیت ہے جس کا ارتکاب وجودِ باری و اعتقادِ بہشت و دوزخ کے بعد بھی انسان نے نہیں کیا اور کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود خلیفۂ ثانی نے اپنے بیٹے پر حد جاری کی۔

مجھے حیرت ہے کہ آپ نے بالکل خلاف حقیقت یہ لکھنے کی جرأت کیونکر کی کہ "شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں کو جب خدائی بہشت و دوزخ پر ایمان پیدا ہو گیا تو پھر انھوں نے خلوت و تنہائی کی بدیوں کے ارتکاب کا خیال تک ترک کر دیا، ان شیر شتر پینے والوں اور سوسمار کھانے والوں نے تو وہ گناہ کئے ہیں کہ باید و شاید۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہر مذہب اپنے ساتھ ایک شریعت لاتا ہے، یعنی دینی عقاید کے ساتھ ساتھ وہ ایک دنیاوی قانون بھی بناتا ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا نظام قایم رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق محض مذہبی عقاید گناہ سے باز رکھنے کے لئے کافی ہوں تو قانون و شریعت کی ضرورت باقی نہ رہے درانحالیکہ شریعت کا نفاذ و اجراء ہمیشہ ضروری خیال کیا گیا۔ کیا اسلام سے آپ ان حدودِ شریعت کو علٰحدہ کر سکتے ہیں جن کی صراحت کلام مجید میں پائی جاتی ہے۔

اس لئے اب سوال صرف یہ باقی رہجاتا ہے کہ آیا "مجردِ عقل" معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے یا نہیں مذہب کا تجربہ تو بہت کافی ہو چکا ہے، اور وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اس لئے اب سوائے اسکے کہ ہم "کارگاہِ عقل" سے مدد چاہیں اور کیا چارۂ کار ہے۔

میں یہ کہنے کے لئے تو طیار نہیں کہ عقل کا استعمال وجوباً انسان کو معصیت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر عقل سے کام لیا جائے تو وہ بہ نسبت مذہب کے زیادہ اس میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

آپ غالباً گناہ کی حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے، یعنی آپ یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ ایک فعل کو معصیت قرار دینے کا کیا سبب ہے۔ آپ کوئی فعل کیجئے اس کا اثر بواسطہ یا بلاواسطہ ضرور سوسائٹی کے نظام پر پڑے گا اور یہی وہ تجربہ تھا جسکی بناء پر عہد قدیم میں اچھے اور بُرے افعال کے درمیان خطِ فاصل کھینچا گیا — انسان کے گناہ کا علم کسی الہام کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ خود حیاتِ دنیاوی کے تجربات نے اس کو بتایا ہے کہ یہ فعل بُرا ہے اور وہ اچھا۔

پھر جب انسان کو اول اول اس کی عقل یا اس کے تجربہ نے یہ بتایا ہوگا کہ چوری کرنا بُرا ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ

جس فعل کو خود اس نے بُرا قرار دیا تھا، اس کے ارتکاب کے وقت اس کے دل نے ملامت نہ کی ہوگی اور کیا قلب و ضمیر کی بار بار ملامت نے اس کو اس حرکت سے متنفر نہ کر دیا ہوگا۔

فرض کیجئے آپ ایک شراب خوار سے کہتے ہیں کہ "دیکھو شراب نہ پیو، ورنہ خدا برہم ہو جائے گا اور تم کو جہنم میں پھینک دیگا"، اب دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ واقعی خدا اور اس کے جہنم کا قایل تھا یا نہیں تھا، اگر تھا تو یہ عقیدہ اسے شراب خواری سے باز نہ رکھ سکا۔ لیکن اگر نہیں تھا تو بھی خدا و جہنم پر ایمان لانے کے بعد اس کا میخواری ترک کر دینا ضروری نہیں جبکہ بالکل یہی عقیدہ رکھنے والوں میں کبھی پوری طرح اس کا انسداد نہ ہو سکا۔ اس کے مقابلہ میں دوسری صورت استمداد عقل کی اختیار کیجئے یعنی ایک شراب خوار کو بتایئے کہ اس کی یہ مذموم عادت خود اس کی صحت کے لئے بہت مُضر ہے اور وہ اس کا عادی ہو کر اپنے قوائے عمل کو برباد کر رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اس نصیحت سے متاثر ہو کر یقیناً ترکِ میخواری پر آمادہ ہو جائے گا، لیکن وہ اس فعل کی قباحت کو ضرور تسلیم کرنے لگیگا، اور اس طرح ممکن ہے کسی وقت وہ اس سے باز آجائے۔

گناہ دوسرا نام ہے ترکِ فرایض کا اور ایک فرض کسی شخص پر اسی وقت عاید ہوتا ہے جب اس سے کوئی مفید نتیجہ مترتب ہو اس لئے ایک شخص کا کسی طمع یا خوف کی مدد سے ادائے فرض کی طرف متوجہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے احساسِ فرض نہیں، لیکن اگر وہ بغیر خیالِ مُزد و اندیشۂ تعزیر اپنے فرض کو ادا کرتا ہے تو بیشک یہ سمجھا جائے گا کہ احساسِ فرض شناسی اُس میں موجود ہے۔

دوزخ کا خوف یا بہشت کی لالچ دلا کر کسی کو اچھے کام کی طرف راغب کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ناسمجھ بچے کو مٹھائی کی لالچ یا مار کے خوف سے پڑھنے کی طرف مایل کرنا اس لئے مذہب کا انسان سے یہ مطالبہ کہ وہ بہشت و دوزخ کا یقین کرے، گویا اس کو حد درجہ احمق و بے وقوف قرار دینا ہے اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ واقعی ایسا ہی گدھا ہے۔

اعمالِ انسانی کے مختلف مدارج ہیں، اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ کوئی کام صرف تعمیلِ حکم کی حیثیت سے کرے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے، کہ بلا خیال احتساب فرض کو محض فرض سمجھکر انجام دے اس لئے اگر مذہب کسی شخص کو اچھے کام کی طرف مایل کر بھی سکتا ہے تو پہلے اس کے غلامی و محکومی کی اسپرٹ پیدا کر دیتا ہے برخلاف اس کے عقل کی رہبری و ہدایت آزادی ضمیر و حریتِ فکر و رائے پر قایم ہوتی ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

یہاں تک تو صرف منطقی بحث تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کچھ قیل و قال کر سکیں، لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ امریکہ میں جو جدید نقشے ارتکاب جرائم کے مرتب کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ۹۰ فی صدی مُجرم وہی ہیں جو کسی نہ کسی مذہب کے پابند ہیں اور ملحدین میں ارتکاب جرائم کا اوسط دس فی صدی بھی نہیں ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی ثبوت اور آپ کو درکار ہے۔

آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ والے اسلام کے پابند نہیں ہیں اور آپ ذکر کر رہے ہیں اسلام کا کیونکہ جس حد تک وجود باری اور بہشت و دوزخ کے عقیدہ کا تعلق ہے وہ بالکل آپ ہی کے ہم آہنگ ہیں اور مرنے کے بعد عذاب و ثواب کی حقیقت کو بالکل آپ ہی کی طرح تسلیم کرتے ہیں۔

شیطان و ابلیس کے متعلق حال ہی میں ایک مقالہ پیش کر چکا ہوں، جنات پر بھی کافی لکھا جا چکا ہے اور ان کو کوئی علیحدہ ناری یا نوری مخلوق تسلیم کرنا علم و عقل کی رسوائی سے زیادہ نہیں۔

قربانی وغیرہ کے عقاید انسان کے عہدِ وحشت کی یادگار ہیں۔ "اسفارِ موسیٰ" والا مضمون جو مسلسل کئی ماہ سے نکل رہا ہے اسے بغور پڑھئے، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں بہت سی روایات وہی رائج ہیں جو اسرائیلیات کے تحت ہیں اور جن کی صداقت سخت مشتبہ ہے۔

سمن بغرض قرار داد امور تنقیح طلب

مقدمہ نمبر ابتدائی $\frac{93}{1911}$ سنہ ۱۹۳۷ء

بعدالت جناب حفیظ الکبیر خاں صاحب بہادر آنریری منصف لکھنؤ مقام لکھنؤ

چندی پرشاد عمر تخمیناً ۵۶ سال ولد بدے رام قوم برہمن ساکن سعادت نگر عرف سورجپور پرگنہ مہوہ تحصیل ملیح آباد ضلع لکھنؤ۔ مدعی

بنام

پتی وغیرہ ---------- مدعا علیہ

بنام پتی عمر تخمیناً ۴۰ سال ولد پراگدین قوم برہمن ساکن سعادت نگر عرف سورجپور پرگنہ مہوہ تحصیل ملیح آباد ضلع لکھنؤ

واضح ہو کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت حاصلہ ۱۳ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ سوا ۱۶ راہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء وقت ۱۰ بجے پر اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جملہ دستاویزات کو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ تمہاری غیر حاضری میں سموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۱ راہ ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

تنبیہ --- اگر بیانات تحریری کی ضرورت ہو تو لکھنا چاہئے کہ تم کو (یا فلاں فریق کو یعنی جیسی کہ صورت ہو) حکم دیا جاتا ہے کہ بیان تحریری بتاریخ ۹ راہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء تک گزرانو۔

وقت حاضری بدفتر آنریری منصفی لکھنؤ ۱۰ بجے سے چار بجے تک

دُھواں

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں میری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

مخدوم محی الدین ایم۔ اے

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مکاں

وہم زائیدہ خداؤں کا روائت کا غلام
پرورش پا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جسکے اُس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ

ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں "ہوں" نہ ہاں "کچھ بھی نہیں
اِک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اِک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اس زمیں موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اِک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم محی الدین ایم۔ اے

موت کا گیت

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اُٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرہ کا تبسم دیکھو

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں
دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا،
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا،

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کے لئے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کے لئے
قصرِ شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لئے
پھونک دوں قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی،
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی،

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

مخدوم محی الدین ایم۔اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن

پُرسش

میں آج کتنا خوش ہوں، ذرا مجھ کو دیکھئے
ہوں بے نیازِ ارض و سما مجھ کو دیکھئے

دُنیا مری نگاہ میں اِک نغمہ زار ہے
اور زندگی طلسمِ نشاط و بہار ہے

حیران ہوں کہ میرے تو ہم کدھر گئے
صد رنگ وسوسوں کے تلاطم کدھر گئے

غم کی گرفت سے مجھے آزاد کر دیا
مسرور کر دیا، مجھے دلشاد کر دیا

ٹھکرا کے چل رہا ہوں ہر اک شے کو راہ میں
ہے آج گرد سلطنتِ جم نگاہ میں

گفتار اِک سرودِ طرب ہے، کہ نرم ہے
رفتار موجِ بحر کی مانند گرم ہے

ہوں بلبلے شراب کے جیسے ایاغ میں
یوں کھل رہے ہیں پھول سے پیہم دماغ میں

موسیقیوں کا لوچ ہے نبضِ خیال میں
دل وجد میں ہے اور طبیعت اُبال میں

سنجیدہ و خموش سا گو جا رہا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے مگر گا رہا ہوں میں

واللہ! خوش نصیب ہے انسان کسقدر
ارزاں ہے انبساط کا سامان کسقدر

ملنے لگا ہے کوئی بڑے التفات سے
بس! عرش پر مزاجِ معلّٰے ہے رات سے

عدم

عشق اور فرض

عشق کا نقش مٹا دے دلِ رنجور سے اب
یہ مشقت نہ اُٹھیگی ترے مزدور سے اب

زندگی خود ہی بڑا بوجھ ہے، غم اور نہ دے
مجھکو رہ رہ کے محبت کی قسم اور نہ دے

تلخ اور ٹھوس حقایق کے مقامات کو دیکھ!
میرے دشوار مراحل، مرے دن رات کو دیکھ

کتنے سنگین فرایض کی نظر ہے مجھ پر
کتنے تیروں سے ہیں دو چار مرے قلب و جگر

زندگی جنگ کا میدان ہے، گلزار نہیں،
برق کی کوند ہے نغمات کی جھنکار نہیں

عشق اک کھیل ہے جیتے ہوئے انسانوں کا
میری گردن پہ ابھی دانت ہے طوفانوں کا

مجھ کو دے، اذن کہ میں موت پہ اک وار کروں
اپنی تقدیر کے سورج سے ذرا پیار کروں

میری جرأت، مری ہمت، مری آواز کو دیکھ
اور مرے گرم خیالات کی پرواز کو دیکھ

مجھ کو بگڑے ہوئے حالات پہ چھا لینے دے
عشق کے موسمِ جاں بخش کو آ لینے دے

رقص جب تیرے اشارے پہ کریں ماہ و نجوم
اور ترے پاؤں پہ ہو عشق کے سجدوں کا ہجوم

وہ صدا آئی، بلایا مجھے، جاتا ہوں میں
بس، مری جان!، ابھی لوٹ کے آتا ہوں میں

علدم

ہم آہنگی

دیکھ کر تجھ کو میں مخمور سا ہو جاتا ہوں
اور احساس سے مغرور سا ہو جاتا ہوں

کہ ترے کوچے سے جو وقت گزرتا ہوں میں
اور نظر تیری طرف شوق سے کرتا ہوں میں

تو ترے رخ سے مسرت سی ٹپک پڑتی ہے
جھوم کر ایک کلی جیسے مہک پڑتی ہے

جس طرح دوست ہیں دیرینہ شناسا ہیں ہم
(آہ! کس چیز کے مرہونِ تقاضا ہیں ہم)

تو شناسا تو نہیں مجھ سے مگر بات ہے کیا،
یہ دل آویز و فسوں ساز کرامات ہے کیا

کہ مجھے دیکھ کے دل تیرا اُچھل پڑتا ہے
آنکھ میں چشمۂ وحشت سا اُبل پڑتا ہے

میں بھی واقف تو نہیں تجھ سے مگر آہ نہ پوچھ
دل میں ہے کتنا ترا درد، تری چاہ نہ پوچھ

تیرے کوچے میں تڑپتا ہوا آتا ہوں میں،
دل کی تسکیں یہاں افراط سے پاتا ہوں میں

ناشناسائی میں بھی کتنے ہم آواز ہیں ہم
ایک مرکز کی طرف مائلِ پرواز ہیں ہم

علدم